ثقافتی اظہار اور زبان: عربی اور اردو کی مشترک ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ

(Language and Culture: Cultural Study of Arabic and Urdu Common Proverbs)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

ولاء رجب

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، 2024ء

ثقافتی اظہار اور زبان: عربی اور اردو کی مشترک ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ

مقالہ نگار

ولاء رجب

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، 2024ء

©ولاء رجب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ثقافتی اظہار اور زبان: عربی اور اردو کی مشترک ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ

پیش کار: ولاء رجب رجسٹریشن نمبر: Reg No. 63B/M.phill/Urdu/F21

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نعیم مظہر ________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر شہزاد منیر ________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ ________________

اقرار نامہ

میں، ولاء رجب حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔ اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم۔ فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

ولاء رجب

مقالہ نگار

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	i i
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	viii

باب اول: تعارف و بنیادی مباحث 1

أ: تمہید

i. موضوع کا تعارف

ii. بیان مسئلہ

iii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

iv. تحقیق کی اہمیت

v. تحدید

vi. مقاصد تحقیق

vii. تحقیقی سوالات

viii. نظری دائرہ کار

ix. پس منظری مطالعہ

x. تحقیقی طریقہ کار

ب۔
1۔ ضرب الامثال کے معنی و مفہوم کی اہمیت 8
2۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کے سماجی و ثقافتی پس منظر 13
حوالہ جات 24
باب دوم: عربی اور اردو ضرب الامثال کے ثقافتی عناصر کا مطالعہ (جغرافیائی ثقافتی تناظر میں) 26
اَ۔ جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں لباس و بود و باش 29
ب۔ جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں رسوم و روایات 45
ج۔ جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں علوم و فنون 58
حوالہ جات 74
باب سوم: عربی اور اردو ضرب الامثال کے ثقافتی عناصر کا مطالعہ (اعتقادی ثقافتی تناظر میں) 77
ا۔ اعتقادی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں مذہبی رسومات، توہمات 79
ب۔ اعتقادی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں اساطیر 97
حوالہ جات 115
باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات 117

ا۔ مجموعی جائزہ	117
ب۔ نتائج	121
ج۔ سفارشات	122
کتابیات	124

ABSTRACT

Title:

(Language and Culture: Cultural Study of Arabic and Urdu Common Proverbs)

Culture is an aspect in which the identity of nations and regions is established and this recognition is their national identity throughout the world. In it, the way of life of the people, customs, traditions, sciences and arts, religious values and mythological matters are also discussed. And above all the linguistic aspect is important in which linguistic variation is a mirror of temporal changes In which proverbs play the most important role. Proverbs are present in every language of the world and in all of them there is some resemblance. The culture and lifestyle of the people of their region is revealed in proverbs. A proverb not only contains wisdom and intellect but also contains a complete reference to society, customs and traditions. In this research, by comparing the sayings of two different societies and cultures, i.e., Arabic and Urdu, similarities and differences have been brought out at the linguistic and semantic level. If we study the proverbs carefully, we get some special qualities like: wisdom, brevity, long experiences, laws of intelligence and paranormal expression etc. The points that have emerged from the comparison of the sayings of both languages are more important; In any proverb, regional customs, customs and traditions, arts and sciences and local religious customs, superstitions and myths are taken for cultural expression. There is no difference in vocabulary and meaning in some proverbs of Arabic and Urdu. The same wisdom appears. Some of the proverbs of Urdu are influenced by the Arabic culture, which is due to the religion of Islam. In Urdu and Arabic proverbs, there is abundant mention of their own geographical culture.

اظہارِ تشکر

الحمدللہ!

میں اس قابل ہوئی ہوں کہ ایم۔فل اردو کا مقالہ لکھ پائی اور وہ بھی پاکستان میں۔اس سارے معاملات میں میں سب سے پہلے اپنے اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی امی اور ابو کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انھوں نے مجھ کو یہ حوصلہ اور ہمت عطا کی اور میں ایک دیارِ غیر میں ایسی ڈگری کرنے کے اہل ہوئی۔یقیناً میرے بہن بھائی بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بھی ہمیشہ میری ہمت بندھائی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ میں مصر کی یونیورسٹی جامعہ الازہر الشریف سے اپنے اساتذہ ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم ڈاکٹر تبسم منہاس اور ڈاکٹر فاطمہ بدرالدین،ڈاکٹر ریہام عبداللہ،ڈاکٹر ھناء عبد الفتاح اور ڈاکٹر ھند محفوظ اور ڈاکٹر نھی مصطفی ڈاکٹر نعمہ الجنایني ڈاکٹر ولاء سید اور ڈاکٹر تغرید بیومي کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر لمحہ اور ہر کام میں میری مدد فرمائی۔یقیناً پردیس میں میرے لیے ان کی ہر بات کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

پاکستان میں میری یونیورسٹی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد کے شعبۂ اردو کے استاد بھی میرے لیے نہایت قابل احترام ہیں اور میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔خصوص بالخصوص صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا کہ انھوں نے ہی مجھے ایم فل کی ترغیب دی اور میری رہنمائی کی۔اس کے ساتھ میں ڈاکٹر نعیم مظہر کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جنھوں نے میرے مقالے کی نگرانی کے فرائض نبھائے۔وہ ایک شفیق،محنتی اور حد درجے خلوص سے گائیڈ کرنے والے استاد ہیں۔خدا ان کو سلامت رکھے۔ان کے علاوہ مجھے پڑھانے والے محنتی اساتذہ بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جن میں ڈاکٹر صنوبر الطاف،ڈاکٹر صوبیہ سلیم،ڈاکٹر ابوبکر صدیق،ڈاکٹر عثمان غنی رعدؔ،ڈاکٹر محمود الحسن رانا،ڈاکٹر عابد حسین سیال،ڈاکٹر نازیہ یونس اور ڈاکٹر بشریٰ پروین شامل ہیں۔

دنیا میں کوئی بھی انسان اکیلے میں کچھ نہیں ہوتا،اسی لیے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میری رہنمائی جس جس شخص نے کی میں ان سب کی ممنون ہوں۔سب سے بڑھ کر پاکستان میں مصری ایمبیسی اور مصر میں پاکستانی ایمبیسی میں موجود تمام افراد کی کہ انھوں نے کسی بھی معاملے میں تاخیر کرنے کی بجائے ہمیشہ مجھے اول ترجیح دی اور تمام معاملات کو خود نبھایا،بے شک سفارتی معاملات بہت مشکل ہوتے ہیں۔

پاکستان میں رہنے والے تمام مصری ہم وطنوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح میرے کام آتے رہے اور حوصلہ بڑھاتے رہے،جن میں انجنئیر طارق حمدی اور مسٹر ولید احمد،انجینئر احمد عزالدین،انجینئر محمد سید،انجینئر بہادر عبداللہ،انجینئر عمرو

امام، انجینئر عمرو ھریدی، انجینئر اسلام زین الدین، انجینئر محمد سلیم اور ان کے ساتھ ساتھ وہ تمام لوگ بھی شامل ہیں کہ جن کا نام لے کر میں یہاں اظہار نہیں کر سکی۔

ڈاکٹر عبدالمجید بغدادی، صدر شعبہ عربی زبان و ادب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد اور ڈاکٹر محمد منور، صدر شعبہ جرمن زبان و ادب، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مقالے کی تکمیل میں ہر طرح کا تحقیقی و تنقیدی مواد بہم پہنچایا۔

آخر پہ میں ایک بار پھر سب احباب کا شکریہ ادا کرتی ہوں ان مصری اور پاکستانیوں کا بھی کہ جن کا نام کسی وجہ سے لکھنے سے رہ گیا۔ شکریہ

باب اول: تعارف و بنیادی مباحث

الف۔: تمہید

i. تعارف

کسی بھی زبان کا منظوم ادب ہو یا نثری اسالیب، محاورہ، روز مرہ، محاورات، کہاوتیں اور ضرب الامثال کی اہمیت ادب میں اظہر من الشمس (واضح) ہے۔ ان سے کسی قوم کا مجموعی شعور اور اس کی ثقافتی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اردو ادب میں روز مرہ، ضرب الامثال، محاورات اور کہاوتوں کا بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اگر ان کے صحیح اور واضح پس منظر اور معانی کا درست علم نہ ہو تو آدمی صحیح مفہوم سے بہت دور بھٹک جاتا ہے۔

علمائے عمرانیات کسی ملک کی کہاوتوں (ضرب الامثال) کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ کہاوتیں قدیم سماجی فکر، معاشرتی روابط اور کسی سماج میں رہنے والے اشخاص کے سماجی اقدار کی مظہر ہوتی ہیں۔ ضرب الامثال کی ثقافتی جہات کے مطالعے سے زبان اور ثقافت کے مابین رشتوں کی وضاحت ہو سکے گی۔ زبان کی مذکورہ اصطلاحات کے ثقافتی مطالعے کا مقصد ان اصطلاحات کے ثقافتی ورثے کا احیاء اور بازیافت ہے۔ جس سے زبان کی تاریخ، فرہنگ، معاشرت، اور تاریخی حقائق کو بھی اجاگر کیا جا سکے گا۔

.ii بیانِ مسئلہ

بیشتر ضرب الأمثال عرب اور اردو میں بھی مشہور ہیں، اور بہت سے ایسے محاورات ہیں جو عربی سے اردو میں یکساں ہیں یا مشابہ ہیں۔ یہاں کچھ عربی ضرب الأمثال ہیں جو اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں:

کبھی اندھے کے ہاتھ بھی بٹیر لگ جاتی ہے۔ حتی العمی یعرف الطریق إذا کان مستقیماً

رب رمية من غير رام۔

سانپ کا بچہ سنپولیا۔

ولد الحر يشبه با بائہ الغر۔ولد الحر يشبه بأبيه الغر

اپنی بساط سے بڑھ کر کوئی کام نہیں کر سکتا۔

لايكلف الله نفساً الا وسعها۔لا يعلم القرد إلا لقمة فمه

آبِ زم زم سے نہانے سے کوئی مومن نہیں بن جاتا۔

الكلب كلب و لو طوقته بالذهب۔

آنکھ کے بدلے آنکھ۔جی کے بدلے جی۔

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔الجزاء من جنس العمل

کہنا بیٹی کو سنانا بہو کو۔

أخاطب الكنه، لتسمع الجارة۔

جب گیدڑ کی موت آتی ہے، تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔

اذا جاء أجل البعير حام حول البئير۔إذا جاء أجل البعير حام حول البير -إذا جملٌ حانت منيّته ... أطاف بالبير حتى يهلك الجمل

یہ ضرب الأمثال اردو اور عربی زبانوں میں مشترک ہیں اور ان کا مشترکہ استعمال ہوتا ہے۔اس حوالے سے تحقیق میں قابل قدر کام نہیں ہو پایا۔ اس مقصد کے پیش نظر مقالہ نگار نے " عربی اور اردو کے مشترک ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ " کا موضوع منتخب کیا ہے۔

iii. مقاصد تحقیق(RESEARCH OBJECTIVES) :

۱۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کے ثقافتی اظہار کے معاشرے پر اثرات کا جائزہ لینا

۲۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کے مابین اشتراکات اور افتراقات کا تجزیہ کرنا

.iv تحقیقی سوالات(RESEARCH QUESTIONS) :

i. ضرب الامثال کے استعمال میں ثقافتی اظہار کیسے کیا جاتا ہے ؟

ii. عربی اور اردو ضرب الامثال کے مابین اشتراکات اور افتراقات کیا کیا ہیں؟

.v نظری دائرہ کار(THEORETICAL FRAMEWORK) :

ہر زبان کا اظہار اپنے طور پر ہوتا ہے لیکن سماج کے نشیب و فراز اس کے نظام ترکیبی، ثقافتی سطحوں، تہذیبی لین دین، رہن سہن، رسم و رواج اور طرز معاشرت کو جس طرح کہاوتوں اور ضرب الامثال میں اظہار ہوتا ہے اس طرح کوئی دوسری چیز ظاہر نہیں کرتی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:"ضرب الامثال اور کہاوتیں کسی بھی زبان کے لسانی سرمایے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں یہ زبان کا وہ حصہ ہے جو اس کی عوامی جڑوں کو اس کے ادبی اظہار سے ملاتا ہے۔۔۔۔۔۔ کہاوتیں یا ضرب الامثال گھڑی یا بنائی نہیں جاتیں، کوئی فرد واحد یا ادارہ یا انجمن ان کے وضع کرنے یا بنانے پر مامور نہیں ہوتی"(پروفیسر گوپی چند نارنگ، پیش رس، اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو از ڈاکٹر یونس اگاسکر)۔

اس تحقیقی مقالے میں لوگوں کی طرز معاشرت کے بیان میں کسی علاقے کی ثقافت کے رنگ جھلکتے ہیں جس کے ماخذات جغرافیائی بھی ہوتے ہین فکری بھی اور اس کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو زبان میں ضرب الامثال کی مختلف صورتوں، نوعیتوں، مشابہتوں اور افتراق کو دائرہ تحقیق میں لایا جائے گا۔

vi. تحقیقی طریقہ کار(RESEARCH METHODOLOG):

عربی اور اردو ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ درج ذیل تحقیقی طریقہ کار سے ہو سکتا ہے:

مجوزہ تحقیق کے لیے موضوع سے متعلق تمام بنیادی اور ثانوی ماخذات تک رسائی کو ممکن بنایا جائے گا۔ مختلف کتب، رسالوں ، جریدوں، لائبریریوں اور ویب گاہوں سے مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تحقیق کا طریقہ کار بیانیہ ہو گا۔ ضرب الامثال کے پس منظر اور معانی کا جائزہ لیا جائے گا۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کو معقول اور قابلِ فہم تبادلے کے لئے کوشش کی جائے گی۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق(WORK ALREADY DONE):

اردو میں عربی اور اردو ضرب الامثال کا ثقافتی حوالے سے تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔ البتہ اس حوالے سے اردو میں درج ذیل کتب موضوعِ تحقیق سے متعلقہ نظر آتی ہیں :

1۔ مشترک ضرب الامثال مرتبہ زیب النساء علی خان مہر داد علمد اری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

2۔ اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال، مقبول الہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

3۔ ڈاکٹر صلاح الدین، محمد ثقلین بھٹی، ضرب الامثال اور محاورات، اظہر پبلشرز، لاہور

4۔ندیم حسن بخاری، اردو ضرب الامثال میں عقائد، سماجی اقدار، مقررات اور دقیانوسی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جامعہ پشاور، 2018ء

5۔اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، ڈاکٹر یونس اگاسکر، نشریات، لاہور

.viii تحدید (DELIMITATION):

مجوزہ موضوع میں عربی اور اردو ضرب الامثال کا صرف ثقافتی مطالعہ کیا جائے گا اس کے علاوہ کوئی مطالعہ اس تحقیق کا حصہ نہیں ہو گا۔

.ix پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW):

مجوزہ تحقیقی موضوع کے لیے پس منظری مطالعے کے طور پر درج ذیل مآخذات سے استفادہ کیا جائے گا۔

۱۔اُسید الحق قادری، عربی محاورات، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں شریف، 2011ء

۲۔ نیاز علی بیگ نکہت دہلوی (مؤلف)، محمد ذاکر حسین، ڈاکٹر (مرتبہ)، مخزن فوائد (اردو مصطلحات، محاورات اور امثال کا ایک نادر لغت)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1998ء

۳۔ صلاح الدین، ڈاکٹر، محمد ثقلین بھٹی، (مرتبہ)، ضرب الامثال اور محاورات، اظہر پبلشرز، لاہور، س ن

۴۔ وحیدہ نسیم، نسوانی محاورے، وجے پبلشرز، دہلی، 1982ء

۵۔سید ضمیر حسن دہلوی، دہلی کے محاورے، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، 2008ء

٦۔ فخر الدین صدیقی اثر، اردو محاورے مع ضرب الامثال و مؤنث مذکر الفاظ، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، 1995ء

۷۔نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلی، معیارِ اردو(زبانِ اردو کے محاورات)، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، 2011ء

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۷

x. تحقیق کی اہمیت(SIGNIFICANCE OF STUDY) :

عربی اور اردو ضرب الامثال کا ثقافتی مطالعہ کرنا ایک بہت اہم تحقیق ہے۔ یہ مطالعہ عربی زبان اور ثقافت کے تنوع، تاریخ، اور علمی و فکری وراثت کی تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے عربی زبان کی آمیزہ و ترکیب، مقامی اور تاریخی باس، اور اشاعتی تاثیر کا پتہ چلتا ہے۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کو مطالعہ کر کے آپ عربی زبان کی اصطلاحات، معاشرتی قیمتوں، اور روایات کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تحقیق آپ کو ایک زبان کی سوچ اور روایاتی تشخص کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ثقافتی مطالعہ کے ذریعے، آپ عربی اور اردو ضرب الامثال کے ذریعے عربی زبان کے مشہور فکری و روایاتی مفاہیم کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے آپکی زبانی مہارتیں بہتر ہوتی ہیں اور آپکے تشخص میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مختصراً، ثقافتی

مطالعاتی تحقیق کی مدد سے، آپ عربی اور اردو ضرب الامثال کی اہمیت اور فوائد کو سمجھ سکتے ہیں، یہ آپ کو عربی زبان اور ثقافت کا بہتر دانا بنانے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

1۔ ضرب الامثال کے معنی و مفہوم کی اہمیت:

زبانیں قوموں کی پہچان اور خطوں کی نمائندہ ہوتی ہیں اور یہی زبانیں انسانوں کو اپنے خیالات کی ترسیل اور مافی الضمیر بیان کرنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ انسان، دوسرے انسان سے انھیں زبانوں کی بدولت ہی اپنے رابطے کو بحال رکھتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرتا اور دوسروں کے کام آتا اور اپنے کام نکلواتا ہے۔ یعنی زبان ایک طرح سے انسان کی سب سے بڑی ایجاد اور سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہی زبانیں جب معاشرے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں تو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے ابلاغ اور معنی کی تفہیم میں فرق آتا جاتا ہے، لفظ کی داستاں ایک مکمل کہانی بننے لگتی ہے اور تحقیق کرنے سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ایک لفظ فقط ایک لفظ ہی نہیں، بلکہ صدیوں کا مسافر اور خود میں جہان معنی کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔

زبان کی اسی معنوی تفہیم پہ غور کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں تو اندازہ ہونے لگتا ہے کہ زبان معنوی اور مفہومی سطح پر اپنا ایک مکمل نظام رکھتی ہے اور یہی نظام اردو والوں کے ہاں علمِ بیان کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے۔ جو معنی کی تفہیم عام سطح سے لے کر گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے، جن میں؛ تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل، روزمرہ، محاورہ، کنایہ اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ میرے موضوع کا تعلق علم بیان کی اصطلاح ضرب الامثال سے ہے۔ لہٰذا اسی کی تعریفوں کو جانتے ہیں۔

ضرب المثل کے لیے انگریزی میں proverb, saying, maxim, adage وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں proverb اور saying تو لوگ عموماً استعمال کرتے ہیں مگر maxim اور adage جیسے الفاظ کم کم ہی سننے کو ملتے ہیں۔ اردو میں بھی کہاوت، ضرب المثل اور مقولہ وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں، جن میں کہاوت اور ضرب المثل تو ایک دوسرے کے ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر مقولہ کسی اور معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تینوں میں سے کہاوت کا لفظ عمومی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ضرب المثل اور کہاوت ایک ہی چیزیں ہیں۔ شان الحق حقی جامع الامثال کے دیباچے میں ضرب المثل کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''امثلہ کو ہمارے ہاں ''ضرب المثل'' بھی کہا جاتا ہے۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں ''ضَرَبَت مثلاً'' میں نے مثال دی یا مثل کہی۔ اس کی بنیاد پر اصطلاح بنائی گئی۔ ''[1]

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) میں ضرب المثل کی تعریف دیکھیے:

> ''کہاوت (فت، ک، و، ا، مث) کسی واقعے یا قصے وغیرہ کا نتیجہ جو لگے بندھے الفاظ میں بطور مثال بیان کی جائے، کوئی فقرہ، مصرع یا مقولہ جو بطور نظیر زبان زد اور مشہور ہو مثل، ضرب المثل۔ ''[2]

فرہنگ آصفیہ جلد سوم:

(۲)ضرب المثل (۳) اسم مونث کہاوت مثل بیان کرنا وہ جملہ جو مثال کے طور پر بیان کیا جائے۔ کہاوت (ہ) اسم مونث (۱) کہن۔ قول۔ بچن۔ مثل (۲) ضرب المثل ہوا، وہ بات جو نظراً بار بار زبان پر آئے۔"[3]

نور اللغات جلد سوم:

"ضرب المثل (اصطلاح علم عروض) بیت کا آخری رکن، ضرب آنا، چوٹ آنا، کہاوت (ھ) مونث، مثل۔ ضرب المثل۔"[4]

قائد اللغات کے مطابق:

"ضرب المثل (ع) مونث وہ جملہ، جو مثل کی طرح بیان کیا جائے، کہاوت (کہاوت کو علیحدہ طور سے بیان نہیں کیا)۔"[5]

مندرجہ بالا لغات کے معانی جاننے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرب المثل یا کہاوت ایک ایسا جملہ ہوتا ہے جس میں صدیوں کا نچوڑ، علم ہوتا ہے۔ چند لفظوں کے مجموعے سے بات کا مفہوم کہاں کا کہاں پہنچ جاتا ہے اور مفہوم وسعت کے ساتھ اہمیت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ ایسے جملوں کا مثال کے طور پر آنا بھی ضروری ہے۔ ان میں کسی قسم کی گرامر یا قواعد کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا بلکہ جس طرح سے یہ رائج ہوتی ہیں اسی طرح سے ان کو برتنا ہوتا ہے کہ یہ اہلِ زبان کی روزمرہ گفتگو کا بھی

پابند جملہ نہیں ہوتا۔ اسے یوں کہہ لیں کہ یہ صدیوں سے جس طرح سے استعمال ہوتا آیا ہے اسی طرح سے بولا، سمجھا اور لکھا جاتا ہے۔ اسی مفہوم کو آگے بڑھاتے ہوئے شمس بدایونی لکھتے ہیں:

"ضرب المثل حقیقت کے بیان کا وہ بے ساختہ تمثیلی اسلوبِ بیان ہے جو چند لفظوں میں حقیقت حال کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہی چند الفاظ جب زبانِ زدِ خاص وعام ہو جاتے ہیں تو ضرب المثل کہلانے لگتے ہیں اور یہ الفاظ کسی واقعہ یا چیز کے مشاہدے یا طویل انسانی تجربوں سے ذہن میں پیدا شدہ تاثر کا ذریعہ اظہار ہوتے ہیں۔"(6)

اس پیراگراف میں شمس بدایونی نے بات کو اور بھی واضح کر دیا ہے کہ اس میں یعنی ضرب المثل میں انسانی ذہنی تجربات کا نچوڑ بھی شامل ہوتا ہے جو صدیوں سے ہوتا ہوا ایک زمانے سے دوسرے زمانے اور پھر کئی زمانوں میں سینہ بہ سینہ پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے خلیق احمد صدیقی کی مرتبہ کتاب پر جو پیش لفظ لکھا ہے؛ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ دنیا میں کہاوت کے موضوع پر جو چند بڑے نام ہیں ان میں ایک نام وولف گینگ میڈر کا بھی ہے اور وہ انھیں کے حوالے سے ضرب المثل کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

"کہاوت ایک ایسا مختصر اور زباں زدِ خاص وعام جملہ ہے جس میں استعاراتی انداز میں دانش، سچائی اور اخلاقی تعلیم موجود ہوتے ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔"(7)

میڈر کے الفاظ سے بھی ہمیں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ ان ضرب الامثال کا تعلق زمانوں کے گزرنے، دانش عامہ، استعاراتی مفہوم اور اخلاقی تعلیم سے ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عموماً ہم کہاوت یا ضرب المثل کا استعمال کرتے ہی اخلاقی تعلیم کی خاطر ہیں۔ بلاشبہ یہ ہمارا عمومی رویہ اور طریقہ کار ہے۔

یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر کہاوت یا ضرب المثل مجو معی معاشرتی دانش و علم کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں صدیوں سے لوگوں کی حکمت بھی در آتی ہے جسے سمجھنے کے لیے ہی ادب میں علم بیان کا علم وضع کیا گیا ہے۔ جب کہاوت میں صدیوں کی ذہانت اور دانش در آتی ہے تو اس میں بلاشبہ معاشرتی ثقافت، سماجی علوم اور عمرانی مطالعہ بھی در آتا ہے۔ اس طرح ایک کہاوت میں سماجی رسوم اور رجحانات بھی اپنے پورے وجود کے ساتھ شامل نظر آتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کہاوت جب صدیوں کا سفر کرتی ہے تو اس میں لسانی تغیرات اور زبان کی تبدیلیوں کے مراحل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اردو کے حوالے سے ضرب الامثال کے معنی و مفہوم کو جاننے کی کوشش کی ہے اسی طرح اب عربی میں بھی اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عربی میں مثل کا معاملہ ذرا سا مختلف ہے کہ یہاں مثل ”تشبیہ و نظیر“ کے معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ یعنی اس طرح کہ مثل الشئی بالشئی یعنی کسی چیز کو دوسرے کی مانند بنانا اور اس کی جمع امثال ہے۔[8] یہی لفظ عربی میں کبھی نشانی یا علامت کے طور پر اور کبھی عبرت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ مثل مختلف معانی و مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے جیسے آیت و نشانی، عقبت یا پھر نصیحت و پند وغیرہ۔

علامہ زمحشری کے حوالے سے زیب النسا علی خان لکھتی ہیں:

”مثل عربی زبان میں نظیر و شبیہ کے معنوں میں آتی ہے اور کسی بات کو بطور نظیر و شبیہ کے کہنا چاہیں تو اسے مثل کہتے ہیں۔ضرب الامثال کسی پوشیدہ معنی کو اجاگر کرنے کا نام ہے۔“(9)

ظاہر ہے کہ پوشیدہ معانی سے مراد وہی حکمت و دانائی اور اخلاقی معانی ہیں کہ جن کے پیچھے صدیوں کی ایک دانائی و دانش چھپی ہوئی ہوتی ہے۔علامہ زمحشری بھی اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔دونوں زبانوں میں کہاوت یعنی ضرب المثل کے معنی، مفہوم، استعمال اور اہمیت کو جاننے کے بعد اب ہم ان کہاوتوں کے سماجی و ثقافتی پس منظر کی طرف بڑھتے ہیں۔

2۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کے سماجی و ثقافتی پس منظر

جب ہم کہتے ہیں کہ کہاوتوں میں صدیوں کی روایت اور سماجی کلی دانش پائی جاتی ہے تو اس طرح ہم سماج میں کی ثقافتی حیثیت کو بھی زیرِ بحث لے آتے ہیں اور ایک کہاوت پھر صرف کہاوت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ ہمارے سماج کی جڑوں میں کھبتی چلی جاتی ہے اور جس قدر اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اسی قدر وہ ہمارے سماج اور ثقافت کے زیادہ قریب ہوتی ہے یا یوں کہہ لیں کہ ثقافتی مظہر ہونے کی وجہ سے ہی وہ کہاوت زیادہ سے زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔سماج چیزوں کو زمانوں میں متعین کرتا ہے اور ایک کہاوت تو صدیوں کا سفر کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو اس میں لسانی تغیرات بھی ثقافتی بیانیے کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ کہاوت کے اسی پہلو کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں:

"کہاوت نہ صرف دانش وحکمت لیے ہوئے ہوتی ہے بلکہ سماج رجحانات اور رسوم ورواج کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ بعض مصرعے بھی اسی لیے کہاوت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان میں عمومی سچائی پائی ہوتی ہے اور وہ کہاوت کی طرح کی کسی صورت حال یا واقعے کے کسی خاص پہلو یا اخلاقی سبق کی وضاحت کرتے ہیں۔ کہاوتوں کی زبان سے اس لسانی تغیر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں ہوتا ہے اور جسے لسانیات کی اصطلاح میں لسانی تغیر کہتے ہیں۔"(10)

یہی سماجی، معاشرتی اور رسوم ورواج کا پہلو کسی بھی کہاوت کو اس معاشرے کی ثقافت اور تہذیب سے جوڑتا ہے۔ یعنی کہاوت کا اپنے معاشرے کی ثقافت سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور ہر کہاوت اپنے سماج اور ثقافت کی بھرپور عکاس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ دنیا بھر کی تمام کہاوتیں تجربات ومشاہدات ہی کا نچوڑ ہیں اور بے کراں سمندر کو چند لفظوں کے کوزے میں بند کرنے سے ہی کہاوت یا ضرب المثل جیسا جملہ تشکیل پاتا ہے جسے بعد میں رواج ہو جاتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ مختلف نسلی تجربات اور مشاہدات، قصے اور حکایتیں، عقیدے اور نظریات، حقیقتیں اور توہمات بھی اس کی بناوٹ اور تشکیل میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرتی وجود میں اپنی جڑیں نکالنے کی وجہ سے اس میں قوموں اور عوام کا نفسیاتی رد عمل، بعض فلسفیانہ خیالات، تعقلات و تفکرات، قوانین وضوابط اور بعض اوقات تو ایسے ایسے پند ونصائح شامل ہو جاتے ہیں کہ کہاوت ہی دانش کی اصل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیا کے اقوال، ملفوظات اور سیاسی ومعاشرتی واقعات و تاریخی کہانیاں بھی اس کے ساتھ جڑ جاتی ہیں۔ اکثر اوقات کسی شعر کا ایک مصرعہ یا مکمل شعر بھی کہاوت کے درجے پر پہنچ کر زباں

زدِ عام ہو جاتا ہے اور کہاوت کے ہی طور پر استعمال ہونے لگتا ہے، بہت سے لوگوں کو تو علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کہاوت ہے یا کسی شاعر کا مشہور شعر یا مصرعہ۔ بعض حادثات، لوک کہانیاں اور قبولِ عام حاصل کرنے والے اہم اور کلیدی جملوں اور فقرات کو بھی یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے اور وہ کہاوت یا ضرب المثل کی سطح پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔

کہاوتیں اپنے سماج اور ثقافت کی اس طرح ترجمانی کرتی ہیں کہ کسی بھی اہم ترین موقع و محل پر بر محل ان کا استعمال بات میں وزن بھی پیدا کرتا ہے اور دوسروں کو قائل کرنے میں بھی مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان سے تصدیق وحمایت اور تردید و تائید کو بھی ممکن بنایا جاتا ہے۔ ایک کہاوت کئی ایک پند و نصائح پر بھاری ہوتی ہے اور بطور ایک ناصح کے بھی کام کرتی ہے۔ کسی اہم ترین نکتے کے اثبات اور انکار کے لیے بھی کہاوت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا کہ ہر کہاوت کسی نہ کسی ثقافت، تہذیب، سماج، لسانی تغیر، سیاست، واقعات اور توہم و عقیدے کی حامل ہوتی ہے۔ عربی ثقافت اور عربیوں میں اس بات کا ادراک پایا جاتا ہے کہ کہاوت ہی کسی بھی گفتگو کو مرکز اور نچوڑ ہوتی ہے کہ اس کے بغیر گفتگو اپنے معیار کو نہیں پہنچ پاتی جیسے نمک کے بغیر کھانا بد مزہ رہ جاتا ہے اسی طرح کہاوت کے بغیر کوئی بھی گفتگو بے مزہ یا بدمزہ ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر بھی اہلِ عرب کی ایک کہاوت ہے:المثل فی الکلام کالملح فی الطعام،اس سے مراد یہ ہے کہ روز مرہ زندگی میں کہاوت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو ہے۔ اس کہاوت میں کسی بھی معاشرے کی ثقافت، بود و باش، رہن سہن اور کھانے کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اس بات سے عربوں کی دانائی اور فراصت بھی جھلک رہی ہے۔ ہمیں یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے یہ اس قوم کی بات ہو رہی ہے جو اپنی زباندانی کے سامنے ساری دنیا کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے۔ اس کہاوت سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ کہاوت اور ضرب المثل ہی

ایسی چیزیں ہیں کہ وہ موقع و محل کے مطابق گفتگویں شامل ہو کر اس کی شیرینی و نمکینی میں اضافہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔یہ سارا کچھ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب کسی معاشرے کی ثقافت اور تمد کے ساتھ ساتھ تہذیب اور رہتل کے بارے میں بھی مکمل آگاہی ہو۔یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کہاوت مکمل طور پر اپنے سماج کی رسوم وروایت اور ثقافت کو بیان کرتی ہے۔اسی لیے تمام پہلوؤں میں کہاوت سرفہرست ٹھہرتی ہے۔یہ کہاوت میں خوبیِ معنی ہے کہ چند لفظوں کے جملوں کو سننے کے بعد ذہن فوراًماضی کے کسی جھروکے یاواقعے کی طرف بھاگتا ہے اور قصوں کہانیوں اور لوک داستانوں کا علم چھاننے لگتا ہے۔اسی لیے کہاوت کا صحیح استعمال اور برمحل بولنے کا ہنر بڑے بوڑھوں کو ہی آتا ہے۔سید ابوترائی خطائی ضامن اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”ضرب الامثال کی بنیاد بھی مشہور قصوں یاواقعوں کی طرف ہوتی ہے اس لیے کسی ضرب المثل کو سنتے ہی انسانی ذہن اس واقعے یا قصے کی طرف عود کر جاتا ہے۔“(11)

یعنی جب کوئی مشہور قصہ،واقعہ،حادثہ یا پھر کوئی توہم ذہن میں آتا ہے تو بنیادی طور پر انسان اپنے سماج کی جڑوں،رہتل اور ثقافتی پہلوؤں کی شناخت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور یوں وہ سماج اور ثقافت سے جڑ جاتا ہے۔یہیں سے ضرب الامثال کا نہ ختم ہونے والا رشتہ ثقافت اور سماج اور سماجی اقدار سے پیوستہ ہو تا جاتا ہے۔

ماہرینِ عمرانیات کا ماننا ہے کہ انسانی فطرت اپنے آغاز اور آفرینش سے ہی مشترکہ اور یکساں خصائص کی حامل رہی ہے اسی طرح ان کہاوتوں، ضرب الامثال کا ذخیرہ بھی یکساں اور ایک ہی طرح سے قوموں میں سفر کرتا رہا اور یہاں تک پہنچا ہے۔اس کی بین مثالیں دیکھنے کے لیے ایک دو کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: دوسروں پہ بھروسہ کرنے والا بھوکا رہتا ہے۔

فارسی کہاوت: هرکس به امید همسایه نشست گرسنه می خوابد

عربی کہاوت: من اتكل على زاد غيره طال جوعه. لا يحك جلدك مثل ظفرك.

انگریزی کہاوت:.He who depends on another man's table, often dines late.(12)

یہاں مقصود بات کو سمجھانا ہے وگرنہ اور بھی زبانوں سے ایسی ہی کہاوتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ان چار زبانوں میں ایک ہی مفہوم کی کہاوتیں بیان کرنے کا بھی یہاں ایک خاص مقصد ہے۔پہلی بات تو ہمیں اس بات کا ادراک کر لینا چاہیے کہ ہر قوم میں سماجی وثقافتی طور پر محنت کا درس ملتا ہے اور زورِ بازو کی تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ پر بھروسہ کریں نہیں تو آپ کو آپ کا نصیب ملنے میں دیر ہو جائے گی۔ہم ہندوستان والے یعنی اردو والے کہتے ہیں کہ خود محنت کر کے کھاؤ نہیں تو بھوکے ہی رہو گے۔اسی مفہوم کو ایرانی ایسے کہتے ہیں کہ ہمسائے پہ بھی بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں، نہیں تو تم بھوکے ہی رہو گے۔اب اردو اور فارسی میں تھوڑا سا لفظی بدلاؤ سے ثقافتی ومذہبی رنگ کی وجہ سے کہاوت کا مفہوم گہرا ہو گیا ہے کہ اگر آپ دوسروں کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو آپ کو ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے اور اگر آپ ہمسائے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو آپ کو

اجنبیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ مذہب تو ہمسائے کو برابر کا شریک سمجھتا ہے۔ مگر ایرانی کہتے ہیں کہ آپ نے ہمسائے پہ بھی بھروسہ نہیں کرنا۔ نہیں تو وہ تمھیں دے گا نہیں یا دیر سے دے گا تو تمھارے نصیب میں بھوکا رہنا ہی لکھ دیا جائے گا۔ اسی طرح عربی والے کہتے ہیں کہ تو دوسروں پہ بھروسہ کرے گا تو کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ انگریزی والے کہتے ہیں کہ اگر کھانے والی میز پہ تو دوسروں کے کھانا پیش کرنے کا انتظار کرے گا تو تجھے سب سے آکر پہ ملے گا کہ وہ سب پہلے اپنے لیے پلیٹ میں ڈالیں گے۔ یہاں یہ بات بھی سوچنی چاہیے کہ عربی سب سے فصیح و بلیغ معنی دے رہی ہے کہ جس نے کامیابی کی بات کی، باقی تینوں زبانوں کی ثقافتی وسعت صرف کھانے تک ہی محدود رہی، اگرچہ عربی نے بھی بھوک کا ذکر کیا اور کامیابی کا تناظر بھی کھانے کے ملنے سے ہی تھا۔

اصل میں اردو کہاوتوں کے ثقافتی و سماجی پس منظر میں ایک بات بڑی قابلِ غور ہے کہ اردو ایک دم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی تشکیل میں صدیوں کا سفر شامل ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ زبان اپنی تشکیلی منزل سے آگے بڑھی تو پھر بھی اس نے دوسری زبانوں کو جنھوں نے اسے اپنی لفاظی سے امیر کیا انھیں ترک نہیں کیا۔

اردو زبان نے اپنی عمارت بالکل فارسی کی بنیادوں پہ اٹھائی اور زبان و ادب ہر چیز اور صنف میں فارسی کے اصولوں کو لے لیا۔ اسی طرح فارسی کی ساری تہذیب، ثقافت، کنائے، صنائع، بدائع اور رموز بھی اسی زبان اردو میں چلے آئے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ فارسی پر عربی زبان اور ثقافت کا غلبہ تھا، جس وجہ سے عربی نے اپنی ثقافت اور لسانی امور فارسی میں داخل کر دیے تھے۔ یعنی یہ ایک طرح سے زنجیر کی شکل اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ عربی سے فارسی اور

فارسی سے اردو میں لسانی و ثقافتی پہلو منتقل ہوتے گئے۔ ظاہر ہے اس سارے امر میں صدیوں کا دخل رہا ہے اور اسی لیے اس کو اب اایک دوسرے سے جد کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے کہ جتنا ان کے آپسی رشتوں کی کلیدوں کو الگ الگ کر کے سمجھنا۔ اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عربی اور اردو بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متاثر ہیں اور عربی کا بالواسطہ اردو پر گہرا ثقافتی و سماجی اثر ہے۔ جس کا ثبوت اوپر دی گئی مثالوں سے بھی سمجھ آتا ہے۔ اس کے علاوہ محمد ضیاء الدین انصاری نے بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کا خمیر فارسی سے تیار ہوا۔ اس لیے فارسی جیسی دولت مند زبان کی تمام تر لسانی وادبی خصوصیات اور ایران جیسے قدیم ملک کی تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور فکری روایات اپنی جملہ جلوہ سامانیوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو ادب میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ اس کے علاوہ ایران ایک طویل عرصہ تک عربوں کی سیاسی، ثقافتی اور لسانی اثر میں رہا۔ اس لیے ایرانی معاشرے، اس کے فکری عمل کے ساتھ اس کے ادبیات پر بھی عربی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ اثرات بھی فارسی کے وسیلہ سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اردو زبان وادب نے بڑے دلکش انداز میں ان اثرات کو قبول کیا۔“(13)

اس اقتباس کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کیوں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ عربی کے لسانی و ثقافتی اثرات فارسی معاشرے، ثقافت اور عوام پر پڑے، جس کی وجہ سے وہاں کے ادبیات میں

عربی کے خیالات، لسان وزبان اور ثقافتی عناصر درآئے اور پھر فارسی بادشاہوں کی وجہ سے یہاں ہندوستان میں صدیوں فارسی زبان رائج رہی اور ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام ہونے کی وجہ سے عربی کے اثرات بلاواسطہ بھی اس خطے پر پڑتے رہے اور عربی وفارسی کے اثرات سسے یہاں کے عوام،لوگ، معاشرے اور ادبیات پر بھی ان دونوں زبانوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

اب ہم یہ بھی اک نظر دیکھ لیتے ہیں کہ جب ثقافتوں کا دوسری ثقافتوں سے میل ملاپ ہوتا ہے یا کوئی ثقافت دوسری چقافت پر اثر انداز ہوتی تو کس طرح کے اثرات مرتب کرتی ہے تاکہ ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ کہاوتوں یا ضرب الامثال کے ثقافتی وسماجی پس منظر سے کیا مراد ہے اور ہمیں آگے کس طرف بڑھنا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

> "ثقافت کا تعلق انسان کے شعوری پہلو سے ہے۔ جس میں علم، عقاید، اخلاقی قوانین، رسوم ورواجات اور جمالیاتی اقدار شامل ہیں۔ شعوری پہلو کے ساتھ ساتھ ایک عملی پہلو بھی ہے جسے ہم کردار کہتے ہیں۔ کردار بھی ثقافت کی طرح انفرادی بھی ہوتا ہے اور معاشرتی بھی۔ مجموعی طور پر معاشرے کی اکثریت کا کردار اجتماعی اور معاشرتی کہلائے گا۔"(14)

اس پیراگراف سے ہمیں جہاں ثقافت کے عملی وعلمی پہلوؤں سے آشنائی ملتی ہے وہاں یہ بھی جاننے کا موقعہ ملتا ہے کہ ثقافت کے عناصر کیا ہیں اور یہ کس طرح ایک انفرادی حیثیت سے اٹھ کر معاشرتی اور اجتماعی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ ثقافت کا تعلق ہوتا ہی اجتماعی انسانوں کی سوچ اور فکر سے ہے اور یہیں سے اجتماعی سوچ کے ساتھ کردار ڈھلتے

اور شخصیتوں کی شناخت بنتی ہے۔اسی لیے دنیا بھر کے خطوں کے لوگوں کا رہن سہن اور اٹھنا بیٹھنا اور چاال چلن اپنے اپنے خطے کے مطابق نظر آتا ہے اور اسی بنا پر دنیا ان میں فرق کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔

گوپی چند نارنگ کہاوتوں کے اجتماعی ہونے اور عوامی جڑوں سے منسلک ہونے پر کہتے ہیں:

> "یوں تو زبان کا ہر مظہر سماجی مظہر ہے لیکن سماج کے نشیب و فراز،اس کے نظامِ ترکیبی، ثقافتی سطحوں، تہذیبی لین دین، رہن سہن، رسم ورواج، تیج تہوار اور طرزِ معاشرت اور اس کی گنگا جمنی بو قلمونی کیفیتوں کو جس طرح کہاوتیں اور مثلیں ظاہر کرتی ہیں، کوئی دوسری چیز ظاہر ہیں کرتی۔"(15)

پروفیسر صاحب کی اس بات سے بہ خوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ زبان کا سب سے اہم اور بڑا سماجی اظہار کہاوتیں ہی ہو سکتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کہاوت اور ضرب المثل کو شامل کر کے کی گئی بات میں زیادہ معنوی و تفہیمی وسعت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق معاشرے کی اجتماعی دانش سے ہوتا ہے نہ کہ انفرادی دانش و عقل سے۔اسی لیے کہاوت ہماری ایک ہی وقت میں دوست اور معاون بھی ہو سکتی اور دشمن کی طرح بات کے بخیے ادھیڑ بھی سکتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح وقت میں صحیح مقام پہ بولی گئی کہاوت آپ کی بات کے مفہوم کو چار چاند بھی لگا سکتی ہے اور غلط وقت میں یا غلط کہی گئی کہاوت آپ کے مقام، مرتبے اور مفہوم کو بھی زائل کر سکتی ہے۔اجتماعی دانش جہاں سمیٹتی ہے وہیں بھی اجتماع کو بکھیر بھی سکتی ہے۔

معاشرے میں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو یا کوئی علمی نکتہ نہ حل ہو رہا ہو تو صدیوں سے رائج کہاوت اس مسئلے کے حل کے لیے تیار ملتی ہے اور اس ایک جملے میں ساری مصیبتوں کا حل اور عملی اشارہ موجود ہوتا ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں موقعے کی نزاکت اور محل وقوع کے لحاظ سے کہاوتیں اور ضرب الامثال یاد بھی ہونی چاہییں۔

آخر پہ یہی کہنا ہے کہ کہاوتیں یا ضرب الامثال کسی بھی زبان کے لسانی سرمائے اور ثقافت کے عناصر کا منھ بولتا ثبوت اور کمال ذخیرہ ہوتی ہیں۔ جو عوام کے ذریعے ثقافتی رنگ میں اختیار کر معاشرے اور ثقافت و تہذیب کی جڑوں تک میں سرایت کر جاتی ہیں۔ کہاوتوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انھیں بنایا یا گھڑا نہیں جا سکتا بلکہ یہ خود بخود صدیوں کے فاصلے طے کرتی ہوئی وجود میں آجاتی ہیں۔ اسی لیے کہاوت یا ضرب المثل پر کسی قسم کے قواعد یا اصول وضوابط لاگو نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض کہاوتیں تو اصولوں کو توڑتی بھی نظر آتی ہیں، جن سے لسانی تغیرات کا بھی پتا چلتا ہے۔ ثقافتی پس منظر میں دیکھیں تو کہاوتوں یا ضرب الامثال میں کون سے کون سے معاشرتی یا ثقافتی پہلو شامل ہو سکتے ہیں؟ تو ان میں سماجی زندگی، نفسیاتی رد عمل، انسانی تجربات، فلسفیانہ خیالات، پند و نصیحت، تاریخی واقعات، لوک کہانیاں، شعری ٹکڑے یا مصرعے، ہنسی مذاق، نفرت وانتقام، بزرگوں کے اقوال، معاشرتی طبقاتی ذاتیں، اونچ نیچ، پیشے اور کام، رشتے ناتے، خورونوش کی اشیا، لباس، پوشاک اور زیور، صحت وعلاج، اساطیر، مذہب، رواج ورسوم اور توہمات شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی عناصر مل کر کسی بھی تمدن میں ثقافتی رنگ کو نمایاں کرتے ہیں اور تہذیبوں کی شناخت بنتے ہیں۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھیں تو کہاوتیں یا ضرب الامثال ایک طرح سے معاشروں کو لسانی اظہاریے میں سمجھنے کی سب سے بہترین کلید کا درجہ رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ وارث سرہندی، مرتب، دیباچہ جامع الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،1986ء، ص5

2۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد یازدہم، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی، جون ۱۹۹۳ء، ص191

3۔ احمد دہلوی، سید، فرہنگ آصفیہ جلد سوم، اسلامیہ پریس، لاہور جنوری2006، ص278

4۔ نورالحسن نیر، نوراللغات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹، ص559

5۔ عبدالحکیم خان، ابو نعیم، نشتر جالندھری، قائد اللغات، (نظر ثانی واضافہ سید حامد لطیف چشتی) حامد اینڈ کمپنی، لاہور، طبع دوم ص628

6۔ شمس بدایونی، شعری ضرب الامثال، روشن پبلیکیشنز، یوپی، 1982ء، ص4

7۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ: کہاوتوں کی کہانیاں، مرتبہ خلیق احمد صدیقی، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، 2021ء، ص3

8۔ زیب النساء علی خان / مہرداد علمداری (مرتبین)، مشترک ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2005ء، ص7

9۔ ایضاً، ص7

10۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، کہاوتوں کی کہانیاں، ص 3

11۔ خطائی ضامن، سید ابو ترائی، ضرب الامثال اور ان کا پس منظر، اردو لائبریری سنٹر، بنگلور، 1981، ص 3

12۔ مشترک ضرب الامثال، ص 93

13۔ ضیاء الدین انصاری، محمد، حرفِ آغاز، مشمولہ: کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر، از شریف احمد قریشی، ڈاکٹر، دارالنور، لاہور، 2012ء، ص 3-4

14۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اقبال اور ثقافت، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1986ء، ص 18

15۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، پیش رس، مشمولہ: اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، از یونس اگاسکر، ڈاکٹر، نشریات اردو بازار، لاہور، 2011ء، ص 9

باب دوم: عربی اور اردو ضرب الامثال کے ثقافتی عناصر کا مطالعہ

(جغرافیائی ثقافتی تناظر میں)

ہر علاقے، معاشرے، خطے اور قوم کی اپنی اپنی ثقافت ہوتی ہے، بلکہ ثقافتیں تو ایک ایک خطے میں کئی ایک ہو سکتی ہیں۔ ثقافتیں جہاں لوگوں کی پہچان اور شناخت کو واضح کرتی ہیں، وہاں ان لوگوں کا رہن سہن اور بود وباش بھی واضح کرتی ہیں۔ اس لیے قوموں کا اپنا اپنا ورثہ اور رہن سہن، چلنا پھرنا اور اوڑھنا بچھونا بھی ان ثقافتوں میں کھل کر سامنے آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ثقافت میں صدیوں کا ایک مکمل حصہ خطے کی پہچان بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ثقافتیں پھر ایک دم سے وجود میں نہیں آتیں۔ لوگوں کی ایک ایک عادت اور بات چیت کے قصے آہستہ آہستہ ثقافتی حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔

اسی بات سے تو واضح ہوتا ہے کہ ثقافت میں شناختی مضمرات لوگوں کی پہچان بن جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ لوک کہانیاں اور قصے، علم اور ذہانت اور کتابیں تک بھی علاقائی ثقافت کو واضح کرتی ہیں۔ لوگوں کے بولنے اور بات کرنے سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ یہ شخص دنیا کے کس حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی کے تناظر میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات کسی دور میں کچھ اور ہوتی ہے اور کسی دوسرے عہد میں وقت گزرنے کی وجہ سے کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب بات، گفتگو یا پھر کوئی کہاوت سفر کرتی کرتی مختلف علاقوں سے گزرتی جاتی ہے تو وہاں کی ثقافتی خوشبو میں بھی خود کو رنگتی جاتی ہے۔ یعنی ایک ہی کہاوت مختلف علاقوں میں مختلف حوالوں، لفظوں اور تلمیحوں میں ملے گی، مگر ان کا مطلب ایک ہی ہو گا۔

جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ:

دال میں کچھ کالا ہے۔

مگر انگریزی والے اسی کہاوت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں؛

I smell a rat.

اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں کا مطلب تو ایک ہی ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ضرور خراب ہے یا خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اردو والے اپنے حساب سے کہتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے یعنی کچھ نہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ سارے کا سارا معاملہ درست نہیں ہے اور انگریزی والے کہتے ہیں کہ سارا گھر تو ٹھیک ہے مگر کہیں نہ کہیں کوئی چوہا ہے جس وجہ سے گھر میں بو پھیل چکی ہے یعنی کہیں کچھ خراب بھی موجود ہے۔

ان معاملات کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے عربی میں:

"حرۃ تحت قرۃ" بولتے ہیں۔

اب اس کا مطلب ویسے تو یہ ہے کہ کوئی آدمی جب اپنے ضمیر کے خلاف بولتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ یہاں کچھ نہ کچھ مسئلہ ہے جو یہ آدمی پہلے کی طرح نہیں بول رہا؛ اگر زیادہ واضح کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ہی طاقت ور کے خلاف بولتا ہے مگر اایک دن وہ طاقت ور کی حمایت میں بولنے لگتا ہے تو سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ آج یہ اپنے ضمیر کے خلاف بول رہا ہے تو اس کو ضرور کوئی نہ کوئی خطرہ ہے اور کسی نے اسے دھمکایا ہے یا ڈرایا ہے یا پھر یہ بھی کسی لالچ میں آ گیا

ہے۔یعنی باتوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ جیسے دال میں کچھ کالا ہے یا کہیں سے چوہے کی بُو آ رہی ہے۔یہی ثقافتی رنگ ہیں کہ انگریزی والے صفائی ستھرائی سے پہچان لیے جاتے ہیں، اردو والے کھانے کھانے پکانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی طرح عربیوں کو اپنی زبان دانی پہ مان ہے اور رہا بھی ہے، اس لیے ان کی کہاوت میں ہمیں زبان سے متعلق بات ملتی ہے۔

انھیں ثقافتی ولسانی تجربات کے بارے میں گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

”ضرب الامثال اور کہاوتیں کسی بھی زبان کے لسانی سرمائے میں بڑے اہمیت رکھتی ہیں۔یہ زبان کا وہ حصہ ہے جو اس کی عوامی جڑوں کو اس کے ادبی اظہار سے ملاتا ہے۔“(1)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان ولسان کے ادبی اظہار میں کہاوتیں اور ضرب الامثال ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے کہ ثقافتی وعوامی جڑوں سے انسلاک کی ایک اہم وجہ کہاوتوں کا استعمال اور برتاؤ بھی ہے۔ جیسے ہی کوئی کہاوت یا ضرب المثل ادبی فن پارے کا حصہ بنتی ہے تو وہ فوراً اسی رہتل کے رہن سہن اور ماحول میں رچ بس کر اسی زمین سے ادبی شہپارے کو جوڑ دیتی ہے۔

ثقافتی تناظر میں دیکھیں تو کسی بھی ثقافت کی جڑوں میں بنیادی طور پر چند ایک چیزیں، خیالات اور تفکراتی عناصر ضرور مضمر ہوتے ہیں۔ان میں جغرافیائی و اعتقادی معاملات زیادہ خصوصیات سے سامنے آتے ہیں۔یہاں ہم صرف جغرافیائی عناصر سے بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ کہاوتیں کیسے ثقافت میں رچ بس کر جغرافیائی معاملات میں اپنا اثر ورسوخ دکھاتی

ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے لباس، بودوباش، رسوم وروایات اور علوم وفنون کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے جائزے سے ہم کسی بھی ثقافت کی جغرافیائی خصوصیات کو جان سکتے ہیں۔

الف: جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی واردو ضرب الامثال میں لباس وبودوباش

جغرافیے سے مراد کسی بھی زمینی خطے کا کوئی حدود دوداربعہ ہونا؛ یعنی اس کو آسانی سے سمجھنے کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمین کا کوئی ٹکڑا جہاں پر لوگ رہتے ہیں اور ان کے رہنے سے ایک رہتل وجود میں آچکی ہے۔ اسی رہتل کے تناظر میں وہاں کے لوگ جو لباس پہنتے، کھاتے پیتے اور جیسے جیسے پرورش پاتے ہیں، اسی ماحول کی عکاسی اور جھلک بعض لوک کہانیوں، ادبی فن پاروں اور بڑے بوڑھوں کی باتوں میں بھی نظر آتی ہیں۔ ان سے ہی کہاوتیں اور گفتگو کی تلمیحات کو جنم ہوتا ہے اور بات اپنے علاقے سے جڑ کر سمجھ میں آتی ہے۔ اسی تناظر میں یہاں علاقائی، جغرافیائی لباس اور بودوباش سے متعلق کہاوتوں کے مفہوم، معنی، استعمال اور کردار پر بحث کر کے ثقافتی عناصر کو سمجھا جائے گا۔

علاقائی لوگ اپنی اپنی ثقافت اور رہن سہن کے مطابق اپنی بودوباش کرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ اسی سے ان کی شناخت کا عمل آسان ہوتا اور ان کی پہچان دنیا بھر میں ہو پاتی ہے۔

ہندوستان میں لوگ اکثر شکار کر کے اپنے گزراوقات کرتے ہیں۔ جس کی وجہ یہاں کے جنگلات اور سمندری ماحول کا میسر ہونا ہے۔ اسی طرح جب یہ اپنی بودوباش کے تناظر میں شکار کے لحاظ سے کوئی کہاوت یا ضرب المثل کا ذکر کریں گے تو اس

میں لامحالہ ایسے الافظ یا جانوروں، پرندوں کے نام آئیں گے جو دوسرے علاقوں میں نہیں یا ان علاقوں میں ایسے جانوروں کا شکار نہیں کیا جاتا۔یعنی کہاوت سنتے ہی لوگوں کی بودوباش سے متعلق علم ہو جاتا ہے۔

اردو والے جب کوئی ایسی بات کی تفہیم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب کبھی کوئی ایسا کام ہو جائے یا کسی سے ایسا کام ہو جائے کہ اس سے ذرابرابر بھی توقع نہیں تھی،یعنی اتفاقیہ ہو جانے والا کام؛تو یہ کہتے ہیں۔

اردو کہاوت: کبھی اندھے کے ہاتھ بھی بٹیر لگ جاتی ہے۔

عربی کہاوت: رب رمية من غير رام۔(2)

اب یہاں دیکھنے والی بات یہ ہے کہہ دونوں علاقوں اور زبانوں کی ثقافت مختلف ہے تو کہاوتوں کے الفاظ اور بھی مختلف ہیں ،حالانکہ معانی دونوں کے ایک ہی جیسے ہیں۔دونوں کے کہاوتوں کا مفہوم یہی ہے کہ اچانک ہو جانے والے کام،یا کسی ایسے بندے سے کوئی کام ہو جائے جو کام اس نے کبھی بھی نہ کیا ہو اور اس سے توقع بھی نہ ہو؛یعنی اتفاقیہ ہو جائے۔

اس تناظر میں اردو کہاوت کے الفاظ تو واضح ہیں جب کہ عربی کہاوت کے الفاظ مختلف ہیں۔عربی میں کہا جارہا ہے کہ کبھی ایسے آدمی کا تیر بھی نشانے پر لگ جاتا ہے جس کا نشانہ ہمیشہ خطا ہوتا ہو؛یعنی اتفاقی طور پر کامیاب ہونے والے کے بارے میں یہ کہاوت مشہور ہے۔

اب اردو کہاوت اور عربی کہاوت دونوں میں معانی کی سطح پر کوئی فرق نہیں مگر ثقافتی سطح پر دونوں میں فرق موجود ہے کہ جغرافیے نے اپنے اپنے لوگوں کو سمجھانے کی کاطر اپنے اپنے رسوم ورواج اور بودوباش سے متعلق الفاظ استعمال کیے

ہیں۔ عرب میں چوں کہ تیروں سے شکار کرنا اور جنگیں لڑنے کی روایت مشہور ہے تو وہاں پر تیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہاں ہندوستان میں لوگ تیروں کے بجائے ویسے بھی شکار کرنے کے لیے سو طرح کے جال یا پھندے لگا کر بھی شکار کر لیتے ہیں تو یہاں پر بٹیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ عرب قوم نے تیر کا ذکر کر کے اپنی غالب سوچ کا بھی اظہار کیا ہے کہ تیر مارنے، شکار کرنے یا غالب آنے کا استعارہ بھی ہے۔ جب کہ ہندوستانیوں یعنی اردو دنیا والوں نے اپنی عاجزی اور مسکینی کا دامن یہاں بھی نہیں چھوڑا اور مظلوم بٹیر کا ذکر کیا ہے۔ کسی طاقتور پرندے یا جانور کا بھی ذکر نہیں کیا۔ اس سے دونوں قوموں کی ثقافتی جغرافیائی سوچوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اشتراکی وافتراقی سطح پر یہ کہاوت اپنے معانی میں ایک ہی طرح ہے جب کہ لفاظی میں کہاوتوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک قوم یعنی عرب اپنی غالب اور طاقت ور سوچ کا اظہار کر رہی ہے اور دوسری یعنی اردو قوم اپنی مظلومی اور مسکینی کا اظہار کر رہی ہے۔ ایک کہاوت دونوں ملکوں یا قوموں کے مابین فرق کو ظاہر کر رہی ہے۔

عربوں اور ہندوستانیوں یعنی اردو بولنے والوں کی بودوباش اور رہن سہن میں بہت فرق ہے اسی لیے ان کی کہاوتوں میں بھی فرق ہے۔ لفظ، ثقافت اور طرز بالکل مختلف دکھائی ددیتے ہیں۔ کہیں کہیں عربی کا اثر بھی اردو پر دکھائی دیتا ہے مگر زیادہ تر افتراقی معاملات زیادہ ہی ہوتے ہیں۔

عربوں کے ہاں انسانوں کو غلام بنانے اور بیچنے کی روایت موجود تھی جس کی باقاعدہ منڈیاں لگا کرتی تھیں۔اسی لیے ان کی کہاوتوں میں غلامی کی روش اور بود باش کا بھی ذکر آتا ہے اور اکثر جگہوں پر ایسی مثالیں عربوں کی وہی غلامانہ ثقافت کا بھی اظہار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بودوباش اور پرورش کے تناظر میں کہاوتیں دیکھیے:

اردو میں کہاوت: سانپ کا بچہ سنپولیا۔

عربی میں کہاوت: ولد الحر يشبه بأبيه الغر۔(3)

عربی کی کہاوت کا مطلب ہے کہ آزاد باپ کا بیٹا بھی اسی سے مشابہت رکھتا ہے یعنی آزاد ہی ہوتا ہے۔

اردو میں تو سیدھا سا مطلب ہے کہ باپ برا ہوگا تو اس کا بیٹا بھی برا ہی ہوگا کہ ادب میں سانپ کو ڈسنے والا، موذی اور خطرناک، وحشت والا جانور دکھایا گیا ہے اور حقیقی زندگی میں بھی اس کی یہی اہمیت یا معاملہ ہے۔سانپ کا بچہ سنپولیہ یعنی سانپ ہی ہوگا تو صاف ظاہر ہے کہ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ یہ ایک کہاوت مشہور ہے۔ مگر عربی والوں نے اسے بھی اپنے رنگ اور ثقافت میں رنگ دیا ہے۔ غلامانہ ذہنیت اور پھر آزادانہ تصورِ زندگی؛ یہ بالکل دو جداگانہ تفکرات ہیں۔ غلام آدمی کبھی بھی بڑا نہیں سوچ سکتا اپنی ذات سے آگے نہیں سوچ سکتا اور اس کی خواہشات اور مقاصد بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ جب کہ ایک آزاد آدمی اپنی مرضی سے سوچتا سمجھتا اور بات کرتا ہے۔ اس کے فیصلے ہی اصل فیصلے ہوتے ہیں۔ یہیں سے عربوں کی سوچ اور ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غلاموں کو کس قدر گھٹیا اور کم تر سمجھا کرتے تھے یا ابھی تک سمجھتے ہیں۔ یہ کہاوت ان کی وہی غلاموں کو بیچنے والی ثقافت اور غلاموں کو گھر میں رکھنے کی بودوباش سے ہی سامنے آئی ہے۔

عربوں کی ساری کی ساری معاشرت غلاموں پر ہی انحصار کرتی تھی اور غلام باقاعدہ طور پر عرب معاشرے کا ایک حصہ تھے کہ ان کے بغیر کسی بھی رسم، رواج یا معاشرے کا تصور ناممکن تھا۔

عرب ایک صحرائی علاقہ تھا اور ہے جہاں دور دور تک پانی کا کوئی نشان نہیں تھا بلکہ پانی کے کنوؤں پر کئی کئی مہینے اور سال تک لڑائیاں چلا کرتی تھیں۔ اس لیے عربیوں کی بودوباش میں پانی سے متعلقہ جو کہاوتیں ہوں گی وہ ان کی عدم موجودگی یا عدیم المثالی کی ہوں گی یا اہمیت پر ہوں گی۔ مگر اس سے متعلقہ نہیں ہوں گی جس سے اندازہ ہو کہ عام دنوں میں استعمال پر بھی کہاوتوں میں کہیں دریا، سمندر یا کسی نہر کا ذکر آجائے۔

اسی طرح اردو دنیا میں بھی اپنی بودوباش سے متعلقہ ہی کہاوتیں مشہور ہوں گی اور ہیں کہ جہاں صحرا سے متعلق کہاوت ہو گی تو وہ بھی صحرائی علاقوں سے زیادہ نسبت رکھتی ہو گی۔ اسی بودوباش کو سمجھنے ااور تقابلی طور پر اردو اور عربی ثقافت کی بودوباش سے متعلق کہاوتیں دیکھتے ہیں کہ جن میں دونوں ثقافتوں کے مضمرات کھل کر سامنے آجائیں۔

اردو کہاوت: دریا میں رہنا مگرمچھ سے بیر۔

عربی کہاوت: أین الغراب هو العقاب۔(4)

ان دونوں کہاوتوں کے مفاہیم اور مطالب دیکھے جائیں تو فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مگر ان دونوں کہاوتوں کی لفاظی اور لغوی معنی دیکھے جائیں تو معلوم ہو گا کہ دونوں کہاوتوں کے اندر لسانی ثقافتی افتراق خوب نظر آتے ہیں جس سے دونوں ثقافتوں کا فرق بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

پہلی کہاوت یعنی اردو کی کہاوت میں دریا، مگرمچھ اور بیر کو دیکھا جا سکتا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی فضا میں دریا اور مگرمچھوں کا ذکر عام معلوم ہوتا ہے اور دکھائی ددیتا ہے ااور عوام میں دریا بہت مقبول اور عام لفظ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کیوں کہ اردو کی دنیا میں شروع ہی سے دریا اور سمندر کے الفاظ موجود رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اردو جہاں بولی جاتی رہی ہے وہاں سمندر، دریا قریب قریب رہے ہیں یعنی اگر دکن کا علاقہ ہی دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کہاں مالابار کا ساحل لگتا ہے اور اس کے علاوہ دریا بھی نظر آتے ہیں اور ہندوستان میں کئی دریا بہتے ہیں پانچ تو صرف پنجاب میں بہتے ہیں۔ کشمیر میں بھی ہیں اور ارد گرد بھی۔ اس لیے دریا کا لفظ مل جاتا ہے اور جب دریا کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو خود بخود دریا میں رہنے والے جانور بھی زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ جن میں خطرناک ترین جانور مگرمچھ اور سانپ ہی مانا جاتا ہے ظاہر ہے جب سے کہاوتیں چل رہی ہیں تب اتنے جانور کہاں دکھائی دیتے تھے اور مگرمچھ کو ایک خطرناک ترین جانور مانا جاتا تھا۔ اس لیے کہاوت میں معنوی وزن پیدا کرنے کے لیے مگرمچھ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگرمچھ دیکھنے میں بھی خطرناک اور ایک بڑا زہریلا جانور دکھائی دیتا ہے۔ جس کو دیکھتے ہی انسان پر وحشت اور دہشت کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اس کے بعد اگر عربی ثقافت میں دیکھیں تو دریاؤں کا زیاادہ ذکر نہیں ملتا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پانی، دریا اور سمندر جیسی چیزیں تو مفقود تھیں۔ مصر میں دریائے نیل کے علاوہ دریا یا پانی کا تصور عام سطح پر نہیں تھا اور ہر طرف صحراا اور خشکی کی بدولت لوگوں اور عوام میں ایسا تخیل آنا مناسب نہیں اور آیا بھی نہیں۔

مگر عرب ثقافت کے اپنے بھی کچھ نمائندہ جانور یا چیزیں ہیں کہ جنھیں وہ بخوبی استعمال کر سکتے تھے اور اانھوں نے انھیں ہی کیا۔یعنی مندرجہ بالا کہاوت کو دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ جس کا مطلب ہے کہ کہاں کوا اور کہاں چیل؟ اس کہاوت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوا کبھی بھی چیل یا عقاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا جیسے کو آدمی دریا میں مگر مچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔اسی طرح کوئی کوا اڑنے میں عقاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ عرب اور اردو دنیا نے اپنی اپنی بودوباش کے مطابق ہی لفظ استعمال کیے ہیں اور بتایا ہے کہاوتوں کے ذریعے کہ عرب میں چونکہ صحرا اور ریگستان ہوتے ہیں اس لیے وہاں کا پسندیدہ پرندہ عقاب ہے کہ جس کے ذریعے آج بھی صدیوں سے لے کر وہ اسی پرندے سے شکار کھیلتے ہیں اپنی بڑھوتری اور برتری کی علامت سمجھتے ہیں عقاب کو اور پھر ایسی ثقافت اور ایسی ثقافتی بودوباش میں ایک کوا کہاں مقابلہ کر سکتا ہے ایک عقاب کا۔کوا مردار کھاتا ہے اور عقاب شکار کر کے کھاتا ہے۔کوا بلندی پہ نہیں اڑ سکتا اور عقاب بلندی پہ نہ اڑے تو اس کی توہین ہے۔کوا کمزور اور ناتواں ہوتا ہے جبکہ عقاب طاقت اور بہادری کی علامت ہے اور وہ بہادر ہوتا بھی ہے۔کوا دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے جبکہ عقاب دوسروں کا سہارا بنتا ہے۔اس کے علاوہ دونوں میں اور بھی بہت سے افتراقات پائے جاتے ہیں۔

اب اگر ان دونوں ثقافتی کہاوتوں پر نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جغرافیائی بودوباش میں ہی لفظوں کا ستعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح ان کی پہچان بنتی ہے۔بودوباش میں ہی لوگوں کی لفاظی اور رہتل یعنی رہنے سہنے کا اندازہ ہوتا ہے اور کسی بھی کہاوت کو سن کر وہاں کی بودبوش اور ثقافت کا جغرافیائی معاملات کو دیکھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔

ہر بود و باش میں لوگوں کا اپنا اپنا جو رہن سہن اور کھانا پینا ہوتا ہے اسی لحاظ سے اس کا رشتوں اور تعلقات سے نبھاؤ اور سبھاؤ کا ایک خاص طرز بھی ہوتا ہے جس سے لوگ اپنے اپنے رشتوں کو بلاتے، بولتے، احترام کرتے اور ان کے ساتھ برتاؤ کو نبھاتے ہیں۔

اب اپنی اپنی ثقافت میں اسی طرز پر لوگوں کے جغرافیائی ماحول اور فضا کا اانداز ہ ہونے لگتا ہے جو ایک ثقافت کو دوسری سے مختلف بھی کرتی ہے اور ان کو پہچان بھی عطا کرتی ہے۔ رشتوں، تعلقات اور معاملاتِ زندگی کے بارے میں دونوں زبانوں کی کہاوتیں دیکھیے:

اردو کی کہاوت: کہنا بیٹی کو سنانا بہو کو۔

عربی کی کہاوت: أخاطب الكنه، لتسمع الجارة۔(5)

اردو اور عربی دونوں کہاوتوں کا مطلب ایک ہی ہے اور معنوی سطح پر بھی مفہوم میں ایک ہی معنی اخذ ہوتا ہے۔ مگر استعمال ہونے والے الفاظ بتاتے ہیں کہ ثقافتوں میں لوگوں کی جغرافیائی بود و باش بالکل مختلف ہے اور یہ دو کہاوتیں دو ثقافتوں کی نمائندہ ہیں۔

اردو کی کہاوت تو بڑی مشہور کہاوت ہے اور ہم روزمرہ زندگی میں اسے بولتے ہی رہتے ہیں اور اس کا چلن کافی ہے۔ جس کے لیے اردو والوں کے ہاں ایک اور کہاوت بھی موجود ہے یعنی؛ ترکی پٹے، تازی کے کان ہوں۔ مطلب اس سے یہ کہ اگر ترکی

والوں کو ماریں گے تو تازی عنی ایرانی خود بخود سبق سیکھیں گے۔ جس طرح بیٹی کو ڈانٹیں گے تو بہو خود بخود سمجھ جائے گی کہ کس کام کو کرنا ہے اور کس کام سے رکنا ہے۔

عربی کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ "بہو کو کہو کہ ہمسایہ سن لے"۔ یعنی کسی بات پر اگر آپ ہمسائے کو سمجھانا چاہتے ہیں تو اپنی ہی بہو کو ڈانٹو یا اونچی آواز میں کہو تا کہ ہمسایہ سن لے اور وہ اس کام کو کرنے سے باز رہے یا کرنے کی ہامی بھر لے۔

دونوں کہاوتوں کا مطلب تو ایک ہی ہے مگر لفاظی نے ثقافتی افتراقات کو بڑھا دیا ہے۔ معنی اشتراک موجود ہے مگر لفظی افتراق موجود ہے۔ اسی سے ثقافتوں کئے مختلف ہونے اور رشتوں وغیرہ کی اہمیت اور فرق کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

ہندوستانی ثقافت میں ساس اور بہو کے جھگڑے ازل سے مشور ہیں اور یہ گھر گھر کا مسئلہ ہے جس پر آج تک کنٹرول نہیں کیا جاسکا۔ اس کی وجہ کیا ہے یہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اس لیے یہاں پر بہو اور ساس سے متعلق رشتے کے بارے سے کہاوتیں ہیں اور وہ اپنی ثقافت اور بودوباش کا پتا دیتے ہیں۔ یہ کہاوت بھی انھیں کا ایک نمونہ ہے۔ یعنی اگر ساس بہو کو کوئی بات سمجھائے گی یا بھلے کی کہے گی تو بہو اس کا برا منائے گی اور ممکن ہے کہ ناراض ہو کر میکے بھی چلی جائے یا پھر اپنے خاوند کو اپنی ساس سے لڑوادے، یعنی کچھ بھی ممکن ہے۔ اس لیے ساس براہِ راست بہو کو کہنے کی بجائے اپنی بیٹی کو کہے گی یا ڈانٹے گی تا کہ بہو سن لے اور سمجھ جائے کہ ساس کیا کہنا چاہتی ہے اور کیا کہنا نہیں چاہتی۔ یہ کہاوت بالکل اردو دنیا کی ثقافتی بودوباش سے متعلق سمجھا رہی ہے ااور واضح کر کے بتا رہی ہے کہ معاملہ کیا ہے۔

اب اگر عربی کہاوت پہ نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عربی ثقافت میں بہو کا زیادہ چلن نہیں رہا یعنی شروع سے ہی یہ عربی لوگ خیموں میں صحراؤں میں رہتے رہے ہیں تو شادی کے بعد ساس، سسر کو اپنی بہو سے پیار ہی رہا ہے اور بہت ہی کم یا نہ ہونے کے برابر ان میں لڑائی کے آثار نظر آئے ہیں۔ اس لیے ان میں پیار ہی پیار نظر آتا ہے۔ جب خاوند اور بیوی الگ خیمے میں رہیں گے تو ان میں پیار ہی ہو گا اور خااوند کے حسنِ سلوک کی وجہ سے اس کے ماں باپ سے بھی بہو کو پیار ہو گا۔ اب اگر بہو سسرال میں ملنے آئی ہے اور اس نے وہاں محبت سے دو چار دن رہنا ہے تو ممکن ہے یہ کہاوت اسی تناظر میں کہی گئی ہو یا استعمال ہوئی ہو کہ سسر نے اگر کوئی بات اپنے ہمسائے کو پہنچانی یا سمجھانی ہے تو وہ اونچی آوازیں اپنی بہو سے بات کرے گا تاکہ اس کا ہمسایہ سن لے اور بات کو سمجھ جائے۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمسائے کو یہ بتانا چاہ رہا ہو کہ آج میری بہو میرے گھر آئی ہے تو لہٰذا آج ادھر نہ آنا یا کچھ خدمت کے لیے لے کر حاضر ہو جاؤ۔ کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے مگر مراد ثقافتی بودوباش میں رشتوں ک تفریق اور اشتراک کا ہے کہ لفاظی نے کہاوتوں میں بودوباش کو واضح کر دیا ہے۔

اس کہاوت سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ عبی لوگ اپنی بیٹی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے مگر بہو سے کر لیتے ہیں اور اردو والوں کے ہاں اس بودوباش میں ثقافتی فرق ہے کہ وہ بہو سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے مگر ضرورت پڑے تو بیٹی سے کر لیتے ہیں۔

ہر جغرافیے کی اپنی بود وباش اور رہن سہن ہوتا ہے اور اسی طرح اس کی ثقافت ترتیب پاتی ہے۔اسی لحاظ سے ہر جغرافیے کا آدمی اپنی ہی ثقافت سے پہچانا اور جانا جاتا ہے۔صحرائی لوگ زیادہ تر پانی کو ترستے ہیں مگر کھجوروں کی فراوانی ہے اسے،اسی طرح جہاں پانی ہے وہاں پر کھجوروں کی کمی ہے۔کہیں گندم ہے تو کہیں چنا ہے۔اسی طرح دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

عربی اور اردو جغرافیے اور ثقافت کی بود وباش میں ایسی بہت سی منفرد اور نئی چیزیں نظر آتی ہیں۔جن سے دنیا فوراً پہچان لیتی ہے کہ یہ دنیا میں کہاں کی اور کس کی بات ہو رہی ہے۔اسی بود وباش کے تناظر میں اردو اور عربی کہ کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: الٹے بانس بریلی کو۔

عربی کہاوت: يحمل التمر إلى البصرة۔(6)

اب ان دونوں کہاوتوں سے دونوں جغرافیائی بود وباش اور ثقافتی پہلو بہت نمایاں ہوتے نظر آرہے ہیں۔اردو کہاوت میں اردو یعنی ہندوستان کی ثقافت اور بود وباش واضح نظر آرہی ہے اور عربی کہاوت میں عربی بود وباش اور ثقافت نظر آرہی ہے۔

اردو کی کہاوت میں جو کہا گیا ہے کہ الٹے بانس بریلی کو،اس کا مطلب ہے کہ جس شخص کے پاس جو ہو اسے وہی لا کر دیں گے تو وہ نہیں لے گا کہ اس کے پاس پہلے سے ہی موجود ہے تو اس سے آپ کا نقصان ہو جائے گا۔

دراصل بریلی،انڈیا کا ایک شہر ہے کہ جہاں کی شہرت ہی بانس کے درخت کو پیدا کرنا ہے تو ایک شخص وہاں پر باہر سے بانس خرید کر لے آیا تو وہاں سے یہ کہاوت بنی۔(7)اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کسی کو کیا ضرورت ہو گی بانس خریدنے کی اور لینے کی۔اور بانس لانے والے کو بہت نقصان اٹھانا پڑا ہو گا۔

اب اگر عربی کہاوت دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ جس عربی میں بھی انھیں کی ثقافت اور جغرافیہ نظر آتا ہے۔ عربی کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ؛ کھجوریں بصرہ کی طرف۔ یعنی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بصرہ جو عراق کا شہر ہے کہ جہاں کھجوریں اکثریت میں ہوتی ہیں اور یہ شہر کھجوروں کی وجہ سے ہی دنیا میں خصوصاً پورے عرب میں مشہور تھا، وہاں الٹا کوئی کھجوریں لے کر جائے گا تو اس سے وہاں کون کھجوریں خریدے گا اور بیچنے والے کو نقصان ہی ہو گا۔

اب دونوں کہاوتوں کے اشتراکات یا افتراقات دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ کھجوریں عرب ثقافت اور بود و باش کی علامت ہیں اور آج بھی عرب دنیا بھر میں کھجوریں برآمد کرنے والے سب سے بڑا خطہ ہے اور اسی طرح ہندوستان یعنی اردو کا خطہ بانس پیدا کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

کہاوتوں کی بود و باش صاف نظر آ رہی ہے جس میں ثقافتی عناصر ہیں کہ بانس والی ضرب المثل اردو خطے میں ہی ہونی تھی کہ بانس کی پیداوار یہاں ہی ہوتی ہے اور کھجوروں کی پیداوار بصرہ میں۔ اب بصرہ کی زبان عربی ہے تو وہاں عربی کی کہاوت میں بصرہ اور کھجوروں کا ہی ذکر آنا چاہیے تھا اور آیا بھی۔ اسی طرح بریلی ہندوستان کا علاقہ اور شہر ہے اس لیے وہاں بانس کا ذکر ہی اردو کہاوت میں آیا اور یہی مناسب تھا۔ کیوں کہ کہاوت کا تعلق عوام اور لوک دانش سے ہوتا ہے تو لوک دانش تو اپنی ہی زبان کو پرکھے اور سمجھے گی۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ بود و باش بھی لوگوں کی جغرافیائی اور ثقافتی رنگوں کی عکاس ہوتی ہے۔

انسان جب بھی دانش کی یا عوامی بات کرتا ہے تو اپنی بود و باش اور رہن سہن کے طریقوں اور جغراافیے سے ہی مثالیں دیا کرتا ہے۔ اسی طرح عربیوں کی رہتل کی نشانی دنیا بھر میں اونٹ ہے اور ان کی رہتل میں اونٹ ہر بود و باش کے کام میں

استعمال ہوتا ہے اب تو عربیوں نے اپنی شناخت کے لیے اونٹ کو دنیا بھر میں اپنے ساتھ رکھنا بھی شروع کر دیا ہے حالانکہ پہلے پہل تو اونٹ صحرائی جانور ہونے کی بنا پر عربیوں کی علامت ہوا کرتا تھا کہ عرب علاقے اور جغرافیے میں اسی جانور اونٹ کا ہی گزارا ہو سکتا تھا کہ اس میں پانی کو محفوظ کرنے کا ایک خدائی اور فطرتی نظام موجود ہے کہ جس سے یہ جانور صحرا میں بغیر پانی پیے بھی کافی دن تک گزارا کر سکتا ہے۔اس لیے عربیوں کی بودوباش کا کافی انحصار اسی جانور پر تھا اور اب بھی ہے۔اس لیے ان کی کہاوتوں میں اونٹ کا ذکر ملنا بعید از قیاس نہیں۔

اسی طرح اردو جغرافیے میں اگر دیکھیں تو اونٹ کے ساتھ دوسرے کئی اور بھی جانور دکھائی دیتے ہیں جس وجہ سے وہ ایسی دانش کی بات یا کہاوت اور ضرب المثل کے لیے اگر اونٹ کا لفظ استعمال کریں گے تو وہ ذرا ناگوار سا بھی گزرے گا اور ان کی رہتل میں بھی پورا نہیں اترے گا۔اس لیے انھوں نے اسی مفہوم کو عوامی دانش میں ڈھالنے کے لیے گیدڑ کا لفظ استعمال کیا۔کیوں کہ اردو والوں کے ہاں یہی لفظ مناسب اور قابل، تفہیم تھا۔ضرب الامثال دیکھیے؛

اردو کہاوت: جب گیدڑ کی موت آتی ہے، تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔(8)

عربی کہاوت: إذاجاء أجل البعير حام حول البير۔(9)

اب ان دونوں ضرب الامثال کو دیکھنے سے بودوباش اور رہتل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح لوک دانش اپنے عومی الفاظ اور اسما سے کسی بھی دانائی کی بات کو دوسروں کے ذہنوں تک پہنچاتی ہے۔

عربیوں نے اپنی بود و باش کے مطابق اونٹ کا استعمال کیا اور ان کی ثقافت اور جغرافیائی بود و باش میں اونٹ ہی مناسب تھا اور اردو والوں نے گیدڑ کا ذکر کیا۔ اب جان لینا چاہیے کہ دونوں نے اپنی اپنی بود و باش میں ان جانوروں کا ذکر کیوں کیا؟

اردو یعنی ہندوستانی خطے میں چوں کہ دیہاتی اور گاؤں والی جگہوں میں ہی گیدڑ پائے جاتے ہیں اور یہ رات کو فصلوں پہ حمہ آور ہو کر اپنی گزر بسر کے لیے کھا پی جاتے ہیں اور دن بھر کہیں فصلوں میں یا دور دور آبادیوں سے چھپے رہتے ہیں اور جب بھی گاؤں والوں کو یا کسی بھی آدمی کو یہ نظر آتے ہیں تو وہ ان پر حملہ کر کے انھیں مار دیتے ہیں اور یوں گیدڑ لوگوں میں آ کر اپنی جان کی بازی ہار جاتا ہے۔ اسی سے یہ کہاوت سمجھ آتی ہے کہ جب تک گیدڑ لوگوں سے دور رہتا ہے زندہ رہتا ہے محفوظ رہتا ہے مگر جب ہی یہ لوگوں کے درمیان یا بھیڑ والی جگہ آیا یہ مارا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے حالانکہ اسے جان بچانے کے لیے شہر سے دور کہیں جنگل یا ویرانے میں جانا چاہیے۔

عربی کہاوت کا مطلب ہے کہ جب اونٹ کی موت آتی ہے تو کنویں کے چکر لگاتا ہے۔ یعنی جب اونٹ جب کنویں کے نزدیک آتا ہے تو اس کا دل ہوتا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ پانی پی کر محفوظ کر لوں اور وہ پانی پیتا بھی زیادہ ہے شاید باقی تمام جانوروں سے بھی زیادہ۔ اس لیے وہ کنویں میں جھکا رہتا ہے اور جھکتے جھکتے اسی یں گر جاتا ہے اور جب اونٹ گر جائے تو اس کو کنویں سے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہاوت عربیوں میں مشہور ہو گئی کہ جب اونٹ کی موت آتی ہے تو وہ کنویں کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے۔

دونوں کہاوتوں کے مطالب اور مفاہیم تو ایک جیسے ہی ہیں بس لفاظی کا اختلاف اس بنا پر ہے کہ دونوں کی بود و باش میں فرق ہے۔ جہاں زراعت ہے وہاں گیدڑ ہو گا جیسے اردو دنیا اور جہاں صحرا ہو گا وہاں پر اونٹ کا ذکر ملے گا جیسے عرب دنیا۔

مندرجہ بالا ضرب الامثال کے تناظر میں ایسی اور بھی کہاوتیں ہیں جن میں علاقائی تناظر، ثقافتی پہلو اور جغرافیائی حصوں کے بارے میں روشنی پڑتی ہے۔ اگر اردو یعنی ہندوستانی علاقے میں کوئی کہاوت وطن کی محبت میں ہو گی تو اس کا تناظر ہندوستانی سرزمین کے تناظر میں بیان ہو گا اور اسی طرح اگر کوئی ضرب المثل عربی میں ہو گی تو وہ عرب جغرافیے اور اس کی بود و باش کے مطابق بیان ہو گی۔

دو کہاوتیں دیکھتے ہیں:

اردو کہاوت: ہر کسی کو اپنا وطن کشمیر ہے۔

عربی کہاوت: کل واحد یحب وطنہ۔(10)

ان دونوں کہاوتوں کو اگر دیکھیں تو معنوی سطح پر دونوں ایک ہی جیسی ہیں مگر لفاظی نے ان کے ثقافتی تغیر اور بود و باش کو واضح کر دیا ہے۔

اردو ضرب المثل میں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی لوگ اپنے ملک سے محبت کا اظہار کشمیر کا نام لے کر کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو والوں کے لیے کشمیر جو کہ ہندوستان (قدیم سے، مگر اب پاکستان اور ہندوستان دونوں میں متنازع علاقہ ہے۔) کا ہی ایک حصہ ہے جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے حتیٰ کہ یہاں کے لوگ اسے جنت کے مترادف

کہتے ہیں کہ یہاں وادیاں ہیں، جھیلیں ہیں، پہاڑ ہیں، خوبصورت دریا ہیں، جھرنے اور آبشاریں ہیں۔اس لیے وہاں کا ہر رہنے والا دنیا بھر میں اپنانام اس خوش قسمتی سے لیتا ہے کہ جیسے اسے کہیں اور رہنے کی ضرورت نہیں تو اردو میں یہ کہاوت اس کی خوبصورتی اور محبت کی وجہ سے مشہور ہو گئی اور ایسے ہی کہا جانے لگا کہ ہمیں اپنا ملک ایسے ہی عزیز ہے جیسے کشمیر والوں کو کشمیر ہے۔

کشمیر کی محبت اور خوبصورتی پر ایک کہاوت بھی ہے جو یہاں کے ارد گرد کے لوگ اور کشمیری بخوبی کہتے اور روزمرہ میں بولتے نظر آتے ہیں کہ:کشمیر جنت نظیر(11)،یعنی کشمیر اپنی خوبصورتی میں جنت سے کم نہیں۔اور ایک جنت کا تصور ہمارے ذہنوں میں کیا ہے اور اسے دنیا بھر میں مذاہب میں کتنی اہمیت حاصل ہے اس پر بات کرنے کا محل نہیں۔اسی لیے اردو والے اپنے وطن سے محبت کے لیے کشمیر سے تشبیہ دے لیتے ہیں۔

مگر عربی کہاوت جس کا مطلب ہے کہ:ہر کوئی اپنے ملک سے پیار کرتا ہے۔اس کہاوت کا مطلب بھی یہی ہے مگر اردو کی کہاوت میں ثقافتی بودوباش اور ارد گرد کے علاقوں اور مضافات کی محبت اور لوگوں کے رہن سہن اور بودوباش سے واضح ہو جاتی ہے۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کہاوت میں اردو والوں نے زیادہ عمدگی سے اپنے اظہار کا چرچہ کیا ہے جب کہ عربی کی کہاوت بالکل سادہ اور عام فہم ہے۔

عربی میں ایک اور کہاوت بھی ہے جو وطن کی محبت میں بہت مشہور ہے کہ: حب الوطن من الایمان۔(12)اس کہاوت سے تو اور بھی اسلامی اور عربوں کی قبائلی زندگی اور شعائرِ زندگی واضح ہوتی دکھائی پڑتی ہے۔مگر دونوں زبانوں کی

دونوں دونوں ضرب الامثال کو بھی دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ اردو کی کہاوتیں زیادہ بہتر اور عمدگی سے وطن کی محبت کو واضح کر رہی ہیں کیوں کہ دونوں میں اپنی ثقافتی جغرافیائی بودوباش اور رہتل نہایت سلیقے اور لوک دانش سے واضح ہے۔ فرق یہ بھی ہے کہ عربی میں وطن سے محبت تو ہے مگر جغرافیائی بودوباش زیادہ واضح نہیں ہو رہی مگر اردو میں جغرافیائی بودوباش اپنے عرج پہ دکھائی دیتی ہے۔

ب: جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی وار دو ضرب الامثال میں رسوم وروایات

جیسے جیسے علاقہ یا کوئی خطہ معاشرتی سطح پر پروان چڑھتا ہے تو وہاں کے رہنے والے لوگ اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے اور اپنے ارد گرد کے موحول کو سمجھنے اور دوسروں کے ساتھ اپنی ززندگی کو گزارنے اور بہتر بنانے کے لیے چند ایک عادتوں اور کاموں کے عادی ہونے لگتے ہیں۔ جو شروع شروع میں تو نہایت کم اور بالکل تھوڑی سی ہوتی ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں کاموں اور عادتوں میں اضافہ بھی ہونے لگتا اور شدت بھی آنے لگتی ہے۔یہی کام یا عادتیں پھر اس علاقے، جغرافیے یا خطے کی رسوم اور روایات بن کر سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جن کو کہیں بھی ہم دیکھتے یا سنتے ہیں تو خاص علاقوں کی رہتل یا مزاج اور عادتوں کا پتا چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جغرافیائی تناظر میں کسی بھی خطے یا علاقے کی اپنی اپنی رسوم وروایات ہوتی ہیں جو ان کی شناخت بن کر سامنے آتی ہیں۔

ناچ گانا دنیا کے ہر خطے کا حصہ رہا ہے چاہے یہ رسم کسی بھی شکل میں نبھائی جاتی رہی ہو مگر رہی ضرور ہے۔اسی طرح اردو اور عربی کلچر یعنی ثقافت میں بھی اس رسم کا ذکر ملتا ہے اور اسی مناسبت سے ایک ضرب المثل دونوں زبانوں میں بہت مشہور ہے کہ جن کو پڑھ کر دونوں ثقافتوں میں رسم وروایت کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اردو کہاوت: ناچ نہ جانے، آنگن ٹیڑھا۔

عربی کہاوت: حجة الرقاصة أن الأرض مائلة۔(13)

دونوں کہاوتوں مطلب ایک ہی ہے اور دونوں زبانوں میں کہاوتوں کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ الگ سے بھی دہرایا جاتا ہے؛جیسے اردو میں "ناچ نہ آئے، آنگن ٹیڑھا" اور عربی میں؛اللی ماتعرف ترقص تقول: الارض عوجہ۔ان باتوں سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لسانی تغیرات کا سفر جاری رہا ہے۔

عربی اور اردو کہاوتوں کا مطلب ہے:کام نہیں آتا تو بہانے بناتا ہے۔کام کرنے کا سلیقہ نہیں،ناحق حیلے حوالے کر کے بے لیاقتی کو چھپانا۔

اس کہاوت کا پس منظر خلیق احمد صدیقی نے کچھ ایسے بیان کیا ہے کہ: کہتے ہیں کہ ایک طوائف تھی جو کہ بہت ہی خوبصورت تھی مگر اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔وہ امر اور ؤسا سے بہت بہت پیسے بٹورتی تھی مگر جب ناچنے کی باری آتی تھی تو کبھی طبلچی کو کہا کہ طبلہ پھوڑ دو اور کبھی سارنگی نواز سے کہا کہ اپنی سارنگی کا تار توڑ دو۔اس طرح وہ گزارا کر لیتی تھی کہ سازندوں کے بغیر کیسے ناچوں؟ مگر ایک محفل میں کچھ لوگ زیادہ ہوشیار تھے تو انھوں نے پھر ایک دن بلایا اور سازندوں کا اہتمام کر کے ناچنے

پہ مجبور کیا اور ناچتے ہوئے اس کے قدم ٹھیک نہیں پڑ رہے تھے اور نہ ہی بدن کا لوچ صحیح طریقے سے اٹھتا بیٹھتا تھا تو کسی نے ٹوک دیا کہ بھئی آج تو سازندے بھی برابر ساتھ دے رہے ہیں، مگر آپ سے ناچا کیوں نہیں جا رہا تو اس طوائف نے آگے سے جواب دیا کہ لگتا ہے کہ آنگن ہی ٹیڑھا ہے۔ اس وقت سے ہی یہ ضرب المثل مشہور ہو گئی۔(14) دونوں کہاوتوں کے معنی اور استعمال بالکل ایک جیسا ہی ہے۔

اگر تقابلی سطح پر دیکھا جائے تو دونوں زبانوں میں اس کہاوت کا پس منظر ایک جیسا ہے اور دونوں میں اس کہاوت کا استعمال بھی ایسے ہی موقع محل کے لیے کیا جاتا ہے جہاں پر کوئی حیلے بہانے سے کام سے دل چرا رہا ہو یا کام صحیح نہ کر رہا ہو اور الزام دوسروں پہ ڈال رہا ہو۔

اشتراکی سطح پر ہی ان کہاوتوں میں ہر چیز مشترک ہے کہ لسانی تغیرات بھی نظر آتے ہیں اور استعمال بھی ایک ہی ہے، پس منظر بھی ایک ہے۔ اس لیے اس کہاوت کے رسمی پہلو میں افتراق کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

بہادری، سچائی اور اچھائی جیسی خوبیاں ہر معاشرے میں افضل اور لازم سمجھی جاتی ہیں۔ مگر کہاوتوں سے ہماری مراد لوگوں کا رہن سہن اور قوموں کی علاقائی و ثقافتی سوچ کا جاننا ہے؛ کہ کہاں کون سی قوم کون سا لفظ استعمال کر کے اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے اور بات کا مفہوم ادا کرواتی ہے۔

اس معاملے میں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ایک ایک کہاوت پائی جاتی ہے مگر الفاظ کے فرق سے قوموں کی ذہنوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ضرب الامثال ہیں:

اردو کہاوت: سانچ کو آنچ نہیں

عربی کہاوت: کن بریئا و اقترب کن مریبا واغترب۔(15)

ان کہاوتوں کے مطالب اور مفاہیم تو سادھے سے ہیں کہ جو آدمی سچا، ایمان دار اور صاف گو ہوتا ہے وہ کبھی بھی مصیبت یا مشکل سے گھبراتا نہیں ہے۔ وہ ہر میدان میں سرخرو ٹھہرتا ہے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ مجھ پہ آنے والی کوئی بھی مصیبت ختم ہو جائے گی کہ میں نے تو کوئی غلط کام ہی نہیں کیا۔

مگر دونوں کہاوتوں کے بیان کرنے میں تھوڑا سا فرق ہے کہ اردو میں سیدھا سیدھا سچے ہونے سے پریشانی سے عافیت کی دلیل دی گئی ہے، مگر عربی میں اس کو تھوڑا سا بدل دیا گیا ہے جس سے عربوں کی ثقافت نمایاں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو گناہوں سے پاک اور بری ہو گا ہمیشہ قرب حاصل کرے گا اور جو گناہ گار ہو گا وہ کبھی قریب نہیں آسکے گا یعنی دور بھاگ جائے گا یا سامنا نہیں کر پائے گا۔

دونوں کہاوتوں کو دیکھیں تو عربی میں ثقافتی رکھ رکھاؤ زیادہ ہے کہ اس میں تین معنی بھی نکلتے ہیں جو ان کی زبان کا خاصہ ہے اور ان میں یہ روایت بھ پائی جاتی تھی کہ قبائل میں ہمیشہ سچے آدمی کو زیادہ سرداروں کی قربت اور صحبت حاصل ہوتی تھی۔ اسی تناظر میں بھی اگر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر تم پاک دامن، پاک باز ہو تو سردار تمھیں اپنا قرب نصیب کرے گا اور اگر تم گناہ گار ہو اور اپنا دامن ناپاکیوں سے بچا کر نہیں رکھ سکے تو کوئی بھی تمھیں منھ نہیں لگانے والا۔ اس کے ساتھ اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو آدمی کسی برائی یا سازش میں شمار نہیں ہوتا یا شامل نہیں ہوتا تو وہ خود بھی ہر آدمی

کا سامنا کرتا ہے اور کبھی منہ چھپا کر پیچھے نہیں بیٹھا رہتا۔یعنی پاک دامنی کسی کے بھی قریب کر دیتی ہے اور گناہ گاری انسان کو دوسروں سے دور بھی کر دیتی ہے۔

اردو میں اس کے برابر مطالب والی ایک اور کہاوت بھی موجود ہے جو اس کے قریب کے معنی دیتی ہے مگر اس میں بھی اس قدر ثقافتی رکھ رکھاؤ یا مضبوطی نہیں جس قدر عربی کہاوت میں ہے؛وہ اردو کہاوت ہے "پاک رہ بے باک رہ"۔یعنی اگر تم نے گناہ نہیں کیا تو تم کہیں بھی بلا جھجک آ جا سکتے ہو اور اپنے اندر خود اعتمادی بڑھا سکتے ہو۔

اردو والوں کی رسوم و روایات عربی سے بالکل نہیں تو کافی حد تک ادب کے اندر مختلف ہیں۔کسی چیز کو چھپانا ہو یا پکڑ کر سنبھالنا ہو تو اردو کی دنیا میں بغل کا استعمال کیا جاتا ہے۔جیسے چلتے چلتے کوئی چیز تھیلا وغیرہ بغل میں داب لیا، کوئی کتاب پکڑی ہوئی ہو تو بغل میں رکھ کر چلنے لگے، کوئی چیز چرائی تو چھپانے کی خاطر بغل میں رکھ لی تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بچا جا سکے۔

اسی طرح کہاوتیں بھی وجود میں آتی گئیں جیسے یا بغل میں چھری، منہ میں رام رام۔ مگر یہاں اردو اور عربی کی دو کہاوتوں کا تقابل کرنا ہے وہ کوئی اور کہاوتیں ہیں۔ دونوں کا مطلب تو بالکل ایک جیسا ہے مگر لفاظی مختلف ہونے کی بنا پر ان کی ثقافتی خوشبو بالکل بدل گئی ہے اور پتا چلتا ہے کہ عربیوں کے ہاں ثقافت کچھ اور ہے اور اردو الوں کے ہاں ثقافت کچھ اور ہے۔کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا۔(16)

عربی کہاوت: ابنه على كتفه و هويطلبه۔(17)

اردو کی کہاوت سے تو وہ سب سمجھ آ جاتا ہے جو کہ اوپر ذکر کیا ہے کہ اردو والے اس بات کو ذکر ایسے ہی کرتے ہیں کہ فلاں کوئی چیز ہے تو اسے بغل میں داب لیا ہو گا۔ اسی طرح بچے کی گمشدگی کا بھی مذکور ہوا تو اسے بغل میں ہی رکھنا مناسب سمجھا اور یہی اس زبان کی ثقافت اور مزاج کے مطابق ٹھیک تھا۔ مگر عربی والوں نے یہی مطالب اور مفہوم اخذ کرنے کے لیے جو کہاوت گھڑی اس میں بغل کی جگہ "کتف" یعنی کندھے کا ذکر ہے۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ زمین آسمان کا فرق ہو گیا دونوں کہاوتوں میں کہ اردو والے بغل کا ذکر کر کے چیز کے پنہاں ہونے ااور اس کے چھپے ہونے کا ذکر کر رہے ہیں جبکہ عربی والے اسی چیز کو کندھے پہ بٹھا کر اس کا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اب یہاں عربوں کی ثقافت کا بھی خوب پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کندھوں پہ اٹھایا کرتے تھے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنے کندھوں پہ اٹھایا کرتے تھے۔

معنوی خوبی اس لیے بھی اردو والوں سے بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں جہاں بغل کا ذکر کیا وہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بچہ اس لیے بھی تلاش کرتے رہے کہ بغل میں بچہ نظر نہیں آ رہا تھا، اگرچہ یہاں مقصود تو بچے کی قربت کا ہے مگر یہ معنی بھی نکل سکتا ہے۔ دوسری طرف عربی میں اس کہاوت کی بلاغت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب پتا چلتا ہے کہ کندھے پہ سامنے، اوپر بچہ بٹھا ہے اور نظر نہیں آ رہا؛ مراد بہت ہی جلد بازی، سستی یا نالائقی والا معاملہ ہو گیا ہے۔

اس کے ساتھ اس کہاوت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عرب ہر چیز کا اظہار برملا کرتے ہیں اور اردو والے چھپا کر پنہاں رکھ کر کرتے ہیں۔ اس تناظر میں عربی کہاوت کی عظمت اور معنوی سطح اردو والوں سے کہیں آگے نکل جاتی ہے۔

دنیا کے ہر خطے میں انسان اپنی معاشرتی و سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اچھے دوستوں کا متلاشی ہوتا ہے اور زندگی کو بہتر سے بہترین کرنے کے لیے دوستوں سے صلاح لیتا ہے، مشورے کرتا ہے اور زندگی کے اہم ترین فیصلے سرانجام دیتا ہے۔

اسی لیے دنیا بھر میں دوستوں سے متعلق کہاوتیں باتیں اور اشعار زباں زدِ خاص و عام ہوتے ہیں۔ اردو اور عربی میں بھی ایسے کئی اشعار باتیں اور کہاوتیں مشہور ہیں جن کو پڑھ اور سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ دوست کی کتنی اہمیت ہے۔ ایسی ہی کہاوتیں دونوں زبانوں میں دیکھیے:

اردو کہاوت: دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔

عربی کہاوت: عند الشدائد تعرف الإخوان-(18) الصديق وقت الضيق

ان دونوں کہاوتوں کی عظمت اور معنوی و ثقافتی اہمیت اپنی جگہ ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی ثقافت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ اس طرح کہ اردو والے یہاں بھی اس کہاوت میں بھی دوست کی بات دوست تک رکھتے ہیں اور مصیبت میں کام آنے والے کو دوست سمجھتے ہیں حالانکہ وہ پہلے بھی دوست ہی تھا۔ مگر عربی والے اس سے ایک درجہ آگے چلے جاتے ہیں اور معنوی سطح پر اپنی کہاوت کو ثقافت میں دور تک لے جاتے ہیں اور وہ مصیبت میں کام آنے والے کو پھر دوست ہی نہیں سمجھتے بلکہ پھر اسے بھائی بنا لیتے ہیں اور بھائی کا درجہ دے کر عمر بھر اس سے بھائی چارہ نبھاتے ہیں۔

عربی ثقافت کی یہی تو اہمیت ہے کہ وہ رشتوں اور تعلقات کا پاس نبھانا جانتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسا صدیوں تک کئی کئی نسلوں تک نبھاتے ہیں۔ ددوست کو اپنے گھر تک لے آنا اور پھر اسے اپنے بھائی جتنا درجہ دینا یہ یقیناً کہاوت کی

اہمیت اور ثقافت کی جڑوں میں دور تک پھیلتا معنوی منظر نامہ واضح کرتا ہے۔یعنی یہ کہنا کہ دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے، ایک الگ معاملہ ہے اور جب آپ کہتے ہیں کہ مصیبت میں بھائی ہی کام آیا کرتے ہیں۔اس کا مطلب بالکل ایک الگ مقام پہ پہنچ جاتا ہے۔

عربی زبان میں کہاوتوں کے مطالب، مفاہیم اور استعمال ثقافتی عظمت کو زیادہ نمایاں کرتا ہے۔اردو والے بھی اپنی ثقافت کے لحاظ سے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں مگر عربی زبان و ثقافت میں پختگی ہونے کی وجہ سے ان کی کہاوتوں کے معنی زیادہ دوررس اور ثقافتی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

عرب ثقافت میں رواج تھا کہ لوگ کسی بھی ایمان دار آدمی کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے اوروہ شخص بہت ہی نایاب، اہم اور قابلِ قدر مانا جاتا تھا جو خائن نہیں ہوتا تھا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس ہجرت کے وقت بھی لوگوں کی امانتیں موجود تھیں جنھیں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے سپرد کر کے آپ مدینے آ گئے تھے۔امانتوں کی رکھوالی اور ذمہ داری اٹھانا عرب کی ثقافت میں بڑی اہمیت کا حامل کام سمجھا جاتا تھا۔

اسی حوالے سے عرب کی ایک کہاوت بھی مشہور ہے جس کے مترادف معانی میں اردو میں بھی کہاوت موجود ہے مگر دونوں میں اپنی اپنی ثقافت کا پرتو موجود ہے۔ کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: چور کی داڑھی میں تنکا۔

عربی کہاوت: الخائن خائف۔(19)

مندرجہ بالا دونوں کہاوتوں کا فرق ثقافتی سطح پر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ عربوں میں جہاں ایمان داری اور امانت داری ایک بہت بڑی کوبی سمجھی جاتی تھی وہیں وہ شخص ہمیشہ خوف، ڈر اور بزدلی کا شکار رہتا تھا جس نے کسی امانت میں خیانت کی ہوئی ہوتی تھی۔

اسی لیے اگر کسی نے خیانت نہیں کی تو وہ بہت حوصلے اور نڈری سے سب کے درمیان حوصلے سے بیٹھتا تھا اور ہر الزام یا پھر سختی کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا تھا۔ مگر جس نے خیانت کی ہوئی ہوتی تھی وہ اپنے چہرے کے تاثرات سے ہی پہچان لیا جاتا تھا کہ یہ چور ہے۔

اردو میں اسی کے متبادل کہاوت بالکل واضح ہے کہ وہ شخص جو کہ چور ہوتا ہے جس نے کسی کا مال مارا ہوا ہوتا ہے یا خیانت کی ہوئی ہوتی ہے وہ کسی کا سامنا نہیں کرتا، بلکہ جب بھی محفل وغیرہ میں بیٹھتا ہے تو اس کے چہرے سے ہی اس کی بے ایمانی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔

یعنی ان دونوں کہاوتوں سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چور یا خائن اپنی حرکات وسکنات سے بتا دیتا ہے کہ میں ہی چور ہوں، وہ اپنی چوری کی چغلی خود کھاتا ہے؛ یا یوں کہہ لینا چاہیے کہ جہاں گڑھا ہوتا ہے پانی اسی طرف بہتا ہے۔ اردو کہاوت کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ایک قاضی کی عدالت میں چوری کا مقدمہ آیا تو قاضی نے تمام مشکوک لوگوں کو اکٹھے کر کے اپنے ہر دلی یا پیادے سے کہا کہ دیکھنا کہ جس کی داڑھی میں کوئی تنکا ہو گا وہی چور ہو گا۔ اس سے پہلے کہ ہر ددلی دیکھتا، چور کے دل میں کھوٹ تھی اس نے فوراً سے پہلے اپنی داڑھی کو ہلانا شروع کیا کہ اگر تنکا ہو تو گر جائے؛ قاضی نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تم ی

چور ہو اور وہ واقعی میں چور ہی نکلا۔ یہیں سے اس کہاوت کا چلن عام ہوا کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔ دونوں کہاوتوں میں اپنی اپنی ثقافت موجود ہے۔ مگر عربی کہاوت میں اپنی ثقافت کی زیادہ نمائندگی ملتی ہے۔ جب کہ چور، داڑھی اور تنکے والے معاملات دنیا میں کسی بھی ثقافت میں مل جائیں گے۔ معنوی سطح پر بھی عربی کہاوت زیادہ بہترین ہے۔

دنیا بھر کے خطوں کے لحاظ سے وہاں رہنے والے لوگ مختلف معاملاتکو سلجھانے اور سمجھانے کے لیے جنگلی اور پالتو جاوروں کی مثالیں بھی دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اردو کے خطے ہندوستاان وپاکستان میں بھی کچھ باتوں کو سمجھانے کے لیے اور بتانے کے لیے مانوس جانوروں کا انتخاب کیا جاتا ہے یا ظاہر ہے کہ جب کسی نے کہاوتاً کہا ہو گا یا کہاوت بنی ہو گی تو سب سے پہلے بولنے والے کی دانش کے مطابق اسی جانور کا نام سامنے آیا ہو گا یا مناسب سمجھا گیا ہو گا۔

جس طرح عظمت کے بیان یا بہادری کے بیان میں ہمیشہ شیر کا ہی نام لیا جاتا ہے اور کم بہادری میں کتے کا نام یا وفاداری کی مثال میں کتے کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر اردو اور عربی معاشرے میں ان دونوں کا تھوڑا سا فرق ہے کہ وہاں بلی کا نام کم ہی استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ وہاں کا شکار کا کلچر ہے کہ عربی لوگ صحراؤں میں کتوں سے شکار کرتے ہیں تو پالتو بلیوں کے بجائے کتوں کا نام اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی دو کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: موئے شیر سے جیتی بلی اچھی۔

عربی کہاوت: كلب طواف خير من أسد۔(20) الكلب الطائر خير من الأسد النائم

اردو کہاوت کا مطلب اور عربی کہاوت کا مطلب تو بالکل واضح ہے اور دونوں اپنے مفاہیم بھی بالکل سیدھے سیدھے آسانی سے بیان کر رہی ہیں۔ مگر عربی اور اردو دونوں نے اپنے اپنے کلچر اور ثقافت کے لحاظ سے جانوروں کے ناموں میں تبدیلی کی ہے۔ کہاوتوں کا مطلب تو یہی ہے کہ پاس والی چیز کم اہمیت والی بھی ہو تو دور کی قیمتی یا اہم چیز سے اچھی ہوتی ہے۔

اردو کہاوت میں شیر اور بلی کا موازنہ کیا گیا ہے اور عربی کہاوت میں شیر اور کتے کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اردو میں کہاوت کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر آپ کے پاس شیر ہے مگر وہ مرا ہوا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، اگرچہ بلی سے ہم شیر یا شکار کے مطلب یا مقصد کا اکوئی بھی کام نہیں لے سکتے، مگر وہ ابلی زندہ ہے تو مرے ہوئے شیر سے کہیں بہتر ہے۔

اسی طرح عربی کی کہاوت میں کہا گیا ہے کہ اگر شیر بیٹھا ہوا ہے اور وہ سکون کر رہا ہے تو طواف کرتا کتا کہیں اچھا اور فائدے کی چیز ہے۔ اس میں اور بھی کئی ایک معنوی سطحیں نظر آتی ہیں کہ عربی ثقافت میں کتے سے شکار کیا جاتا ہے اور شیر بہادری وعظمت کی علامت ہے، اور کتے کو نجس بھی سمجھا اور کہا گیا ہے پھر بھی اگر شیر بیٹھا ہوا ہے، کوئی کام نہیں کر رہا؛ اگرچہ زندہ بھی ہے، پھر بھی اس سے حرکت و عمل کرتا کتا کہیں بہتر اور کام کی چیز ہے۔

معنوی سطح پر یہ دونوں کہاوتیں برابر ہیں کہ بلی اور کتے کا شیر سے تقابل کر کے ایک شاان پیدا کی گئی ہے۔ مگر اردو والی کہاوت ایک درجے پر عربی کی کہاوت سے پیچھے ہے کہ جب کوئی چیز مردہ ہو جاتی ہے تو وہ واقعی میں بوجھ بن جاتی ہے اور کسی بھی حوالے سے کام کی یا کارآمد نہیں رہتی، اب چاہے وہ بلی ہی کیوں نہ ہو مگر زندہ ہے تو مرے ہوئے شیر سے کہیں بہتر ہے۔

دوسری طرف کتے کی مثال سے معنوی سطح اس لیے بلند ہے کہ شیر مرا نہیں ہے بلکہ زندہ ہے بس بیٹھا ہوا ہے تو اس کا تقابل کتے کے عمل یا حرکت سے کیا گیا ہے کہ جو کتا مسلسل چلتا رہتا ہے اور اپنے کام کے ذریعے منزل کی جانب بڑھتا رہتا ہے وہ بیٹھے ہوئے کسی بہترین نسلی شیر سے کہیں بہتر اور کام کی چیز ہے۔

کتا عربی ثقافت میں شکار کی اہم کڑی ہے اور بلی ہمارے معاشروں کے علاوہ دنیا بھر کے معاشروں میں سکون کرنے والی اور گھروں میں رہ کر کھانے پینے اور بس دودھ اڑانے والی مخلوق ہے۔ اس لحاظ سے اردو کی کہاوت میں شیر کے مقابلے میں بلی کہہ کر جان پیدا کی گئی ہے۔

اردو والوں نے اس لیے بھی شیر کے مقابل بلی کا ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بلی شیر کی خالہ ہے تو ممکن ہے کہ لوک دانش یا عوامی سطح پر علمی رائے میں شیر اور بلی کے اسی تعلق اور تلازمے کی وجہ رہی ہو۔ یعنی اردو میں بھی ثقافتی لسانی پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور عربی ثقافت میں معاشرتی روایت اور لسانی معاملے کو سامنے رکھا گیا ہے۔

انسان کی نفسیات بھی بہت مختلف ہیں کہ ہم جس سے پیار کرتے ہیں، اس سے قریب بھی رہنا چاہتے ہیں مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ قریب رہنے سے انسان اپنی اہمیت بھی کھو دیتا ہے اور وہی قربت ہمیں ایک دوسرے سے مانوس کرنے کے ساتھ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خوبیوں سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دنیا میں دھوکے آپ کے رشتہ دار اور دوست ہی دیتے ہیں یا یہی قریبی لوگ آپ کے دشمنوں سے مل کر انھیں آپ کے راز دے کر بھی آپ کو نیچا دکھا سکتے ہیں یا ذلیل کروا سکتے ہیں۔

یہی لوک دانش اور عوامی سطح کی علمی باتیں کہاوتوں کے ذریعے سے بھی ہم تک پہنچی ہیں اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس جدید دور میں ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں قربت ایک فریب کے ساتھ بھی زندہ رہی ہے اور انسان اپنے قریبی لوگوں سے دھوکا کھاتا رہا ہے اور رشتہ داروں کی نظروں میں گرتا رہا ہے اور تعلقات سے مات کھاتا رہا ہے۔

اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ایسے ہی موضوع پر کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: جتنا قریب، اتنا رقیب۔

عربی کہاوت: الأقارب كالعقارب۔(21)

اردو ثقافتی تناظر میں کہاوت کا مطلب بالکل سادہ اور واضح ہے کہ انسان جس کا قرب حاصل کرلیتا ہے اسی کو اپنا رقیب یا دشمن بنالیتا ہے۔ ویسے تو رقیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب نظر رکھنے والا یا نگہبانی کرنے والا ہے۔ مگر اردو میں اس کا مطلب بدل کر کچھ اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ تمھارا دشمن تم پر ہر وقت نظر رکھے ہوئے ہے کہ کہیں سے بھی تمھاری کمزور دیکھے تو تمھیں شکست دے۔ رقیب، نظر، قربت، نگہبانی یہ سب قریب قریب کی چیزیں ہیں اور انسان کو ان کے معانی معلوم ہیں۔

عربی میں اس کا معاملہ ذرا مختلف ہے اور اسی مفہوم کی کہاوت عربی میں اپنی ثقافت کے ساتھ وارد ہوئی ہے کہ جس کا مطلب ہے کہ جو آپ کے قریب ہے وہی آپ کے لیے عقارب یعنی بچھو کا درجہ رکھتا ہے۔

اب اس کہاوت کے مطلب سے یہ بات واضح وہو جاتی ہے کہ عرب کے صحراؤں میں چوں کہ بہت ظالم اور زہریلے قسم کے بچھو پائے جاتے تھے اور اسی تناظر میں اس کہاوت کے معانی اخذ کیے گئے ہیں کہ جو بھی شخص بچھو کی سنگت اختیار کرے گا یعنی کسی کو اپنا رازداں یا قریبی دوست بنائے گا وہی اس کو ڈسے گا اور کبھی بھی زندگی میں سکون نہیں لینے دے گا۔

یہ ایک ایسی عالمی سطح کی سچائی ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے اور سماج میں اس کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو عربی کیا ہر لسانی معاشرے میں مختلف لسانی تغیرات کے ساتھ انھیں مفاہیم کے ساتھ ایسی ہی کہاوت پائی جاتی ہے۔ عربی میں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ: أقاربك عقاربك۔

عربی کہاوت کی معنوی ولسانی سطحیں ہر دو جگہ پہ بلند ہیں کہ رقیب کہنے سے وہ معانی اخذ نہیں ہوتے جو کسی کو بچھو کہنے سے حاصل ہوتے ہیں اور یہی تو کہاوت کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی وار کے اندر صدیوں کا علم نکال کر باہر لے آتی ہے نہ کہ اس طرح کہ اس کو دوبارہ تفہیم کی ضرورت پڑے۔

ج: جغرافیائی ثقافتی تناظر میں عربی واردو ضرب الامثال میں علوم وفنون

جب کوئی علاقہ یا خطہ آباد ہونے لگتا ہے اور آباد ہوتے ہوتے اس کے ہاں لوگ اپنے اپنے حساب اور زاویے سے اپنی معاشرت کو دیکھنے اور بیان کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور پھر بات بھی کرتے رہتے ہیں۔ کچھ وگ زبانی بات چیت میں ہی سب کچھ بتا دیتے ہیں اور کچھ لوگ ان سب معاملات اور ااپنے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیتے ہیں اور

لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح پھر اس علاقے کے فنون اور علوم واضح ہو کر سامنے آنے لگتے ہیں اور کچھ پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ باہر سے بھی علوم کا استفادہ کر کے اس علاقے کی رہتا میں بولے جانے الفاظ میں انھیں بیان کر کے یہاں کی لوکیل میں شامل کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح دونوں طرح سے باہر اور اندر کے محرکات سے اس جغرافیے کے خاص علوم وفنون یا علوم وفنون کے اثرات میں رچی بسی گفتگوئیں سننے کو ملتی ہیں، جن کا چلن ہونے لگتا ہے اور لوگ طرح طرح سے بول بول کر ان جملوں یا فقرات کو زباں زدِ خاص وعام بنا دیتے ہیں جو پھر مخصوص علاقوں کی شناخت بنتے چلے جاتے ہیں اور بعض تو کہاوتوں اور ضرب الامثال کا درجہ بھی اختیار کر جاتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں ثقافتی رکھ رکھاؤ میں سب سے اہم انسان کا بات کرنا اور بات کو سمجھنا ہے۔ جس آدمی کی بات جس قدر اچھی ہو گی، مناسب اور برمحل ہو گی، اس کی بات میں تفہیم، اثر اور قبولیت بھی اسی قدر ہو گی۔ لہٰذا عربی معاشرے اور ثقافت کا تو اختصاص ہی یہ رہا ہے کہ انھوں نے بات کو بول کو باقی تمام اشیا سے ترجیح دی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی عربی دانی پر اور عربی زبان بولنے پر اس قدر نازاں تھے اور ہیں کہ باقی ساری دنیا کو عجمی کہتے، سمجھتے اور پکارتے ہیں۔ اسی تناظر میں عربی اور اردو دونوں ثقافتوں میں، معاشروں میں زبان، لسان اور گفتگو کے علمی معیار کو اہم جانا اور سمجھا گیا ہے اور دونوں کے ہاں ایک مشترک کہاوت نظر آتی ہے۔

اردو کہاوت: انسان اپنے بول سے پہچانا جاتا ہے۔

عربی کہاوت: المرء مخبوء تحت لسانه ۔(22)

دونوں کہاوتوں کا مطلب اور استعمال کرنے کا موقع محل بھی ایک ہے۔ مطلب یہ ہے: انسان کو ہمیشہ سوچ سمجھ کر اور موقع محل کے مطابق بولنا چاہیے۔

بولنا ایک فن بھی ہے اور علمی ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان دو سالوں میں بولنا سیکھ جاتا ہے مگر ساری عمر یہ سیکھنے میں لگا دیتا ہے کہ کیا کہاں بولنا ہے اور کیا کہاں نہیں بولنا۔ یہی اس کے علمی و فنی ہونے کا ثبوت ہے۔

یہ ضرب المثل بھی دونوں عربی و اردو ثقافت میں یکساں معنوں کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ استعمال، مفہوم اور ابلاغ بھی ان کا ایک ہی جیسا ہے۔ اشتراک ہی نظر آتا ہے افتراق نہیں ہے۔

عربوں کے کھیل اور شوق پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں دنیا بھر سے مختلف کھیل ملیں گے اور انھیں کھیلوں کے تناظر میں ان لوگوں کے فن بھی سامنے آتے ہیں۔ عربوں کے کھیلوں میں گھڑ سواری، تیر اندازی، نیزہ بازی، تیراکی اور اسی طرح کی جفاکشی پر مبنی کھیلوں کی دنیا ملے گی۔ یہی کھیل جب عوامی سطح پر اپنے اظہار کے لیے سامنے آتے ہیں تو بڑے بڑے نشانے باز، تیر انداز اور گھڑ سوار میدان میں اترتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تیر اندازی عربوں کا کھیل ہے وہیں اس میں عمدگی پیدا کرنے کے لیے اس کو فن کی سطح تک بھی بلند کر لیا جاتا ہے۔ اور جو بھی شخص اس فن میں طاق ہوتا ہے وہ حاذق کہلاتا ہے۔

اسی فن کی بدولت عربوں میں ایک کہاوت ہے کہ جس کا معنی تو اردو کی کہاوت میں مل جائے گا مگر اس اردو کی کہاوت میں عربوں جیسی لفاظی یا پھر اس فن کا ذکر نہیں ملے گا۔ کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: کبھی اندھے کے ہاتھ بھی بٹیر لگ جاتی ہے۔

عربی کہاوت: رب رمية من غير رام۔(23)

مندرجہ بالا دونوں کہاوتوں میں علاقائی ثقافتی عناصر کی بازگشت اپنے زوروں پہ ملے گی۔یعنی عربی کہاوت میں بجا طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس کہاوت کے ذریعے اپنے ایک معتبر فن یعنی تیر اندازی کا ذکر کر کے اپنی ثقافت کو بلند کیا ہے اور اپنے غلبے کو بھی واضح کیا ہے جو وہ آج تک دوسری اقوام کے بارے میں سمجھتے ہیں۔کہاوت کا مطلب تو صاف ہے کہ کبھی کبھی اس آدمی سے بھی تیر نشانے پہ لگ جاتا ہے جس سے ہمیشہ ہی تیر خطا ہوتا ہے۔یعنی اتفاقیہ بھی اچھا کام ہو سکتا ہے۔

اب اردو والوں کا تناظر دیکھیے یعنی کبھی اندھے آدمی کے ہاتھ بھی بٹیر لگ سکتی ہے یا لگ جاتی ہے۔یعنی بٹیر کا ذکر کر کے مظلوم و مسکین پرندے یا جانور کا ذکر کر کے اپنی مسکین اور عاجزی کو واضح کیا ہے۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ بٹیر پکڑنا کوئی ہندوستانوں یا پاکستانیوں کے نزدیک فن کاری کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ یہ تو علاقائی مجبوری یا ضرورت ہے کہ جس کے تحت لوگ شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔جب کہ عربوں کے ہاں یہ فن اس قدر اہم اور مقبول ہے کہ پورے پورے قبیلے کی عزت اس ایک فن پر قائم ہوتی ہے اور اکثر اس کا اظہار بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔

اشتراکی و افتراقی سطح پر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عربی زبان میں بولی جانے والی کہاوت اپنے غالب ہونے اور قوم کی برتری کی بات کرتی ہے۔جب کہ اردو والوں کے ہاں بولی جانے والی کہاوت اپنی مسکینی اور عاجزی کا دم بھرتی ہے اور اردو والوں کی

ذہنی سوچ چھوٹی ہونے پہ دلالت کرتی ہے۔اس کے علاوہ عربیوں نے اس کہاوت سے اپنے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے اور اردو والوں نے اپنے علاقائی شکار کی بات کی ہے۔

انسان ساری زندگی علم سیکھتا رہتا ہے اور کئی کئی علوم سیکھنے کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ ابھی تک اس نے بہت سا علم اور علوم حاصل کرنے ہیں یہی علم کی خصوصیت ہے کہ جتنا آپ اس کو سمجھتے جاتے ہیں، جتنا اس سمندر میں اترتے جاتے ہیں اتنی ہی اس کی گہرائی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

مگر علم کے ساتھ تجربہ ایک بہت بڑی خصوصیت ہے کہ جو علم کو اصل علم بناتا ہے۔اگر یوں کہہ لیا جائے کہ تجربہ ہی علم کو علم بناتا ہے، تو بے جانہ ہو گا۔ تجربہ ایک ایسی خوبی ہے جس کے لیے آج تک کوئی ادارہ یا کوئی نصاب تیار نہیں ہو سکا۔ بلکہ تجربے ایسا علم حاصل کرنے کے لیے طویل عمر درکار ہے اور انسان اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے بار بار اعادے سے یہ سب کچھ سیکھتا ہے۔

اسی لیے ہمیں ہمارے بڑے بوڑھے سمجھاتے ہیں کہ تجربہ کار آدمی ہی کی خدمت میں بیٹھنا چاہیے اور اسی سے کام کا مشورہ کرنا چاہیے۔ زندگی اس طرح مزید کسی دھوکے فریب یا نقصان سے بچ جاتی ہے۔ مگر ہر معاشرے میں جہاں تجربہ کار ہوتے ہیں وہاں بہت سے نو آموز اور کم تجربہ کار بھی اپنے ہنر کے جوہر دکھانے پہ مائل رہتے ہیں جن کی بدولت معاشروں نے کافی نقصان اٹھایا ہے اور ایسا ہر انسانی دور میں رہا ہے اس لیے انھیں معاملات کو سمجھانے اور سلجھانے کے لیے ایک عوامی اور

لوک دانش کا اظہار ہوا اور لوگوں میں کہاوتیں مشہور ہونے لگیں۔ جن میں ایسی ہی تجربے کے فوائد اور نو آموز لوگوں سے اجتناب کی معقولانہ باتیں واضح ہو کر سامنے آئیں۔ کہاوتیں دیکھتے ہیں:

اردو کہاوت: تجربہ کار کے پاس جاؤ حکیم کے پاس مت جاؤ۔

عربی کہاوت: إسأل مجرب ولا تسأل طبيب ۔(24)

مندرجہ بالا دونوں کہاوتوں کا مطلب، مفہوم اور معانی ایک ہی ہے اور الفاظ بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال ہر معاشرے اور ثقافت میں ایک ہی جیسا ہو کہ علم و تجربے کی جو عظمت ہے وہ کسی نیم حکیم کی نہیں ہو سکتی۔ اردو میں تو اس کے بارے ایک اور کہاوت بھی ہے کہ نیم حکیم جان کا خطرہ۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر آپ اس علم میں باقاعدہ ماہر نہیں اور آپ کی ماہرانہ رائے اس علم میں پتہ نہیں تو آپ کو اس علم سے اجتناب کر کے تجربے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس کا مطلب تو یہی ہے کہ بغیر کسی افتراق کے ہر معاشرے میں علم و تجربے کی اہمیت مسلم ہے۔ اسی طرح اردو اور عربی معاشرے اور ثقافت میں بھی علوم و فن اور تجربے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو حاصل نہیں سکی۔

دنیا کا ہر عقل مند آدمی علم کی قدر کرتا اور علم کے حصول پر زور دیتا ہے۔ اسی لیے دنیا کے ہر مذاہب اور دانش کدے میں علم کی عظمت اور اس کو حاصل کرنے کی بابت ضروریات کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر جدید و قدیم تہذیب و ثقافت میں بھی علم کی برتری اور حصول کو ضرور واضح کیا گیا ہے اور اس کے حاصل کرنے پر شدت سے زور دیا گیا ہے۔

عربی ثقافت اور مذہب اسلام نے علم کی برتری اور حصول پر توجہ دی ہے اور کہا ہے کہ علم ضرور حاصل کرو اور وہی تناسب اور وہی شدت و زور ہندوستانی تہذیب میں اردو کے ذریعے پہنچ ہے۔ اردو میں بھی علم کے حصول کے لیے وہی کہاوتیں مستعمل ہیں جو عربی ثقافت میں ہیں یعنی علم حاصل کرنا فرض کے مترادف ہے۔ کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔

عربی کہاوت: اطلبوا العلم من المهد إلى اللحد ۔(25)

ہمیں معلوم ہے کہ عربی کی کہاوت دراصل حدیثِ مبارکہ ہے اور یہی حدیث بغیر کسی معنی اور لفظ کی تبدیلی کے اردو میں مستعمل ہو گئی ہے۔ دونوں کا مطلب اور معنی ایک ہی ہے کہ زندگی کے آغاز سے لے کر آخر تک علم کا دامن نہیں چھوڑنا اور ہر صورت میں علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

عربی معاشرے کی یہ کہاوت اسلام کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے اور ابھی تک دنیا بھر میں یہی علوم و فنون کا نصب العین مانا جاتا ہے کہ ہر باشعور کو چاہیے کہ علم کا حصول مرتے دم تک کرتا رہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عربی کہاوت اپنی ثقافت کے ساتھ دنیا بھر کی ثقافتوں پہ غالب آنے کی قوت بھی رکھتی ہے۔ یا یہ حضورؐ کا بولا ہوا جملہ مبارک ہے کہ جس کی برکت سے یہ عربی اور اردو دونوں ثقافتوں میں برابر ایک ہی معنی کے ساتھ بولا، سمجھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عربی کی علمی و لسانی ثقافت اردو خطے تک بھی پہنچی ہے کہ جس کو فارسی نے پہلے اپنایا اور بعد میں اردو نے بھی اپنا لیا۔

انسان بلاشبہ اپنی ذہانت اور فطانت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اس کی جتنی بھی پہچانیں ہوتی ہیں وہ ثانوی درجہ رکھتی ہیں یا پھر کوئی درجہ یا حیثیت نہیں رکھتیں۔

علم انسان کی یا کسی بھی خطے کی پہلی ترجیح ہے اور ہونی بھی چاہیے کیوں کہ قوموں میں بڑے کام یہی ہوتے ہیں کہ کوئی علمی یا فلسفیانہ بڑا کام کر کے شناخت بنائی جائے۔اسی تناظر میں ہر قوم میں کئی ایک مثالیں کہاوتیں اوت ضرب الامثال مشہور ہیں اور اکثر سننے کو بھی مل جاتی ہیں۔

اردو میں ہو یا عربی میں یا دنیا کی کسی بھی زبان میں ہو ایسی کہاوتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے اگلی نسلوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔مگر ایسے لوگ کم مگر عیار ہوتے ہیں کہ بات کی گہرائی اور کنائے میں کہی ہوئی باتوں کو بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کا تخاطب ہی وہ علمی لوگ ہوتے ہیں۔ایسے ہی علمی لوگوں کے لیے کہاوتیں مشہور ہیں دو دیکھیے:

اردو کہاوت: عقل مند کو اشارہ ہی کافی ہے۔

عربی کہاوت: للعاقل تکفی الاشارۃ۔(26)و کل لبیب بالإ شارۃ یفهم

دونوں زبانوں کی دونوں ضرب الامثال کا معنی ایک ہی ہے اور مطالب و مفہوم بھی ایک ہی جیسا ہے۔بات سمجھنے کی یہی ہے کہ کسی محفل میں بیٹھے ہوئے جب کوئی دانائی یا فراست کی بات کی جائے تو وہ بات ہر ایک کو سمجھ نہیں آتی اور وہ بات ہر کسی کے لیے ہوتی بھی نہیں۔کیوں کہ اس کا تعلق کسی علم والے سے ہوتا ہے اور دانا شخص ہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔مگر باقی کیا کریں؟وہ تو حیران ہیں،پریشان ہیں مگر سب سے زیادہ شرمندہ ہیں۔

ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ بات اتنی علمی اور گہرے انداز میں کہی گئی علم والے سمجھ گئے اور بغیر علم یا تھوڑے علم والے نہیں سمجھ سکے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے اور دانا علم والے لوگ ہمیشہ راز، کنائے یا پھر رمز میں بات کرتے ہیں کہ جس کو صرف علم والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اصل اور بڑی بات ہمیشہ لفظوں کے اندر اور کہیں نیچے کر کے چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ جس تک پہنچنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں اور بات کے اشارے اور رمز کا پا جانے والا آدمی ہی اس تک پہنچ سکتا ہے باقی سارے محروم رہ جاتے ہیں اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علم اور حصولِ علم کتنا ضروری ہے اور اہم ترین چیز ہے۔

بات کی گہرائی اور اصل علم تک پہنچنے کی یہ کہاوتیں کہ عقل والے کو اشارہ بھی مل جائے تو وہ بات کی گہرائی یا اصل تک پہنچ جاتا ہے، کتنی بڑی اور اہم علمی بات ہے۔ علوم وفنون ہی کسی بھی قوم کے اعلیٰ ہتھیار اور ثقافتی سرمائے ہوتے ہیں اس لیے علوم وفنون کی طرف رغبت مندرجہ بالا دونوں کہاوتوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

جب عقل، علم یا پھر فن کی بات ہو گی تو خود بخود علم اور علم والے لوگوں کو ذکر آجائے گا اور ہر کوئی چاہے گا کہ وہ اچھا، علم والا اور بہتر انسان کہلائے، جس کے لیے علوم وفنون کی ترقی کی طرف راغب ہونا ضروری ہے جو ان ضرب الامثال میں واضح اشارہ ہے۔

اسی تناظر میں اگر ہم یہ بھی کہہ اور مان لیں کہ آدمی یا کسی بھی انسان کا اصل شرف مرتبہ اور رتبہ علم و ادب یا علوم وفنون سے ہی ہوتا ہے تو میرے خیال سے بے جا نہ ہو گا۔

رتبے یا شرف کے تناظر میں ہر زبان میں کئی ایک کہاوتیں مل جاتی ہیں اسی طرح علوم وفنون کے ساتھ برتری اور بہتری کی وجہ سے مرتبے کی بات اردو اور عربی زبانوں میں بھی مل جاتی ہے ملاحظہ کیجیے:

اردو کہاوت: آدمی کا شرف علم وادب سے ہے، نہ کہ مال ونسب سے۔

عربی کہاوت: شرافت الانسان بالعلم والأدب لا بالمال والنسب ۔(27)قال أمير المؤمنين سيدنا علي رضي الله عنه: الشرف بالفضل والأدب لا بالأصل والنسب.

دونوں ضرب الامثال دیکھیں تو ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہاوت عربی زبان سے ہی اردو زبان میں پہنچی ہے۔ جس کے کئی علمی اشارے بھی ملتے ہیں۔

یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر آدمی اور ذی شعور جانتا ہے کہ آدمی کی عزت یا مرتبہ یا اس کا اشرف المخلوقات ہونا اس کے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی تقاضے نبھانے سے بھی ہے اور اصل اور بنیادی انسانی تقاضے وہی آمدی نبھا سکتا ہے کہ جس کے پاس علوم وفنون کی دولت ہو کہ وہ صحیح غلط اور اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ اپنے آپ کو علم کے آئنے میں سدھار سکے۔

اس بات میں دو رائے ہیں ہی نہیں کہ علم کیا ہے اور انسان کو کیسے بہتر کرتا ہے۔ ضرب الامثال سے لوک دانش سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور عالم فاضل ہونے میں اس کے علم کا ہاتھ نہ کہ اس کے باپ یا باپ کے باپ کا ہاتھ ہے۔

انسان کی پہچان خود اس کا کردار اور اخلاق ہے جو علم وادب سے ہی سامنے آتا ہے۔اس کا باپ دادا یا ان کی چھوڑی ہوئی شناخت ایک طعنہ تو ہو سکتی ہے مگر عزت افزائی کا باعث نہیں۔اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ خود جاہلِ مطلق ہے۔

اب اس کہاوت کو اردو اور عربی ثقافتی تناظر میں دیکھیں تو اردو میں یہ کہاوت اتنی عمدگی سے اپنے معانی ثقافتی سطح پر بیان نہیں کر پاتی کہ جتنے یہ معانی عربی ثقافت اور جغرافیے میں بیان کرتی ہے۔کیوں کہ اردو معاشرے میں اچھے برے کی تقسیم تو ہوئی ہی ایسے تھی کہ ااعلیٰ نسلوں والے ہی اعلیٰ مانے جاتے تھے اور ان کے بچے بھی اعلیٰ و برتر مانے جاتے تھے۔یعنی یہ ہندو ثقافت کا عام رویہ تھا اور یہ کسی سے بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔جب کہ اسلام کے آجانے سے اس میں کافی بدلاؤ آیا مگر مکمل بدلاؤ نہیں آ سکا۔

جب کہ عربی معاشرے میں کہاوت خوب بیٹھتی ہے کہ عرب می قبائلی نظام رائج تھا جو کہ آج بھی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قبائلی لوگ اسی تناسب سے سردار کے بیٹے کو سردار ہی امنتے تھے کہ وہ سردار کا بیٹا ہے تو اتنا ہی ذہین ہو گا بہادر ہو گا، مگر ایسا ہوتا نہیں تھا اور لوک دانش کے مطابق ہونا بھی نہیں چاہیے کہ بادشاہ کا بٹا بادشاہ تو نہیں ہو سکتا کہ انسان کے افضل اور اشرف ہونے کی وجہ حسب نسب نہیں بلکہ علم وادب ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں یہ کہاوت عربی معاشرے کی اردو کو دین ہے اور اردو والوں کے ہاں بھی اس کے معانی کوب برتے گئے ہیں۔

بنیادی نکتہ اس کہاوت کا بہت واضح اور خوب ہے کہ اپنے آپ کو علم سے بڑا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ حسب نسب کے جھمیلے اور جھانسوں سے۔

علوم وفنون کی عظمت دنیا کی ہر قوم اور ثقافت بیان کرتی ہے اور اس بات میں کوئی دورائے بھی نہیں ہیں۔ مگر جب کوئی آدمی کسی بھی خطے یا قوم یا زبان کا ایک خاص علم حاصل کرنے کے بعد زمانے کا استاد اور عالم بنتا ہے تو اس کی بات اور اس کی ہر ایک کتاب زمانے بھر کے لیے رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے اسی طرح دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اگر وہ صحیح بات کرنے کی بجائے غلط بات کر دے تو اس کی خطا زمانے کی خطا سے بھی بڑھ کر مانی جائے گی۔ اس لیے اہلِ علم لوگوں کا علمی معاملوں میں احتیاط کا رویہ اپنانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس معاملے پر اردو اور عربی میں کہاوتیں موجود ہیں، دیکھیے:

اردو کہاوت: عالِم کی لغزش، عالَم کی لغزش ہوتی ہے۔

عربی کہاوت: زلة العالِم زلة العالَم-(28) إذَا زَلّ العَالِمُ زَلَّ بِزَلَّتِهِ عَالَمٌ

عربی میں زلۃ قصور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی صاحبِ علم شخص کوئی قصور کرے تو وہ اس قدر بڑا اور خاص قصور اور غلطی کہلاتی ہے کہ ساری قوم کو واس کا ازالہ بھگتنا پڑتا ہے۔

عالِم کی بڑی فضیلت ہے اور ہر قوم، ثقافت اور زبان والے اپنے اپنے اہلِ علم لوگوں کی بہت قدر اور عزت کرتے ہیں۔ مگر جب یہی علم والے کوئی غلطی کرتے ہیں تو اس غلطی کا بار بھی ساری قوم پر پڑتا ہے۔ اس کہاوت میں دونوں ثقافتوں اردو اور

عربی میں یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں ایک عالِم شخص کی عزت اور مرتبہ زیادہ ہے وہاں اس سے غلطی کے مواقع بھی زیادہ ہیں تو اسے چاہیے کہ بھٹکنے کی بجائے قوم اور علم کی عزت کو بچائے کہ اس کی غلطی کا بار پوری قوم پر آئے گا۔

ان ضرب الامثال کا ایک مطلب اور بھی ہے کہ جب کوئی علم والا غلطی کرتا ہے تو اس کا قصور ساری قوم کے برابر اس لیے ہے کہ نادان یا عام آدمی کی غلطی کا اثر اسی آدمی تک رہتا ہے اور اس سے آگے نہیں بڑھتا مگر جب کوئی صاحب علم، یعنی عالم شخص غلطی کرتا ہے تو اس کا اثر اس کے ماننے والوں کے ذریعے پورے زمانے پہ پہنچتا ہے اور ہر شخص اس غلطی کو یوں روز مرہ کے کاموں کی طرح دہراتا چلا جاتا ہے کہ گویا وہ کام اسی کے لیے کہا گیا ہے۔ بڑھے قابل، تقلید مانے اور سمجھے جاتے ہیں اس لیے انھیں زیادہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے چاہییں۔ یقیناً یہ کہاوت بھی اردو میں عربی کے روسط سے ہی پہنچی ہے کہ اس میں مذہبی رنگ ہی غالب ہے اور یہی ثبوت کافی ہے۔

ااسی تناظر میں عالِم کے علم اور مرتبے پر ایک اور بھی ضرب المثل ہے وہ بھی دیکھتے چلیں:

اردو کہاوت: عالِم کی موت، عالَم کی موت ہوتی ہے۔

عربی کہاوت: مَوتُ العَالِمِ مَوتُ العَالَم ۔(29)

یہ کہاوت بھی علم، عالِم اور فن کی عظمت اور مرتبے کے بارے میں ہے مگر یہاں پر علمی لوگوں سے بھول چوک یا سہو پہ بات کرنے کے بجائے علم اور عالم کی عظمت پہ بات کی گئی ہے کہ جب کوئی علم والا شخص اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو صرف وہی ایک شخص دنیا سے رخصت نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس کا علم بھی ہم سے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس لیے

اتنے بڑے عالِم کے علم سے ایک زمانہ استفادہ اور فیض اٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے تو گویا وہ زمانہ بھی اسی کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے کہ اب ان لوگوں کو جو پیچھے اس کی قوم بچ رہی ہے اس کو کون علمی فائدہ پہنچائے گا۔یعنی ایک عالِم کی موت نہیں ہوئی بلکہ ایک زمانے کی موت ہو گئی ہے۔

مندرجہ بالا چاروں ضرب الامثال علم، فن اور عالم کی عظمت پہ زباں زد عام ہیں اور کتابی دنیا سے یہ بات عام لوک دانش تک اسی لیے سرایت کر گئی کہ اس سے بڑی اور سچائی زمانے مییں کیا ہو سکتی ہے اور لوک دانش سے زیادہ کون سا علم ہو گا زمانی سچائی کو پرچار نہ کرے۔

علم و فن میں اپنی ایک طاقت اور کشش ہوتی ے اور ایسے آدمیوں کا اٹھنا بیٹھنا بھی دوسروں سے مختلف اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اس لیے جب یہ کسی محفل میں بیٹھے ہوتے ہیں تو ان کے سامنے ایسی علمی باتیں بھی ہو جاتی ہیں کہ جو اشارے اور کنائے میں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں مگر سب لوگ اس بات کی گہرائی اور اشارے اور رم کو نہیں پا سکتے مگر پانے والے پا جاتے ہیں۔

اس لیے ایسی محفلوں میں بات کو بیان کرنے والا کبھی بھی بات کو پھیلا کر اور طوالت سے بیان نہیں کرتا بلکہ ایسے مختصر اور جامع انداز میں بیان کرتا ہے کہ جاننے والے جان جائیں اور نہ جاننے والے نہ جانیں۔اس کے ساتھ ساتھ کم وقت میں زیادہ باتیں بی ہو جائیں کہ علم والوں کا وقت زیادہ قیمتی ہوتا ہے اسی موقع پر پھر چند ایک کہاوتیں مشہور ہیں جو بولی جاتی ہیں کہ سننے والے سمجھ جائیں۔کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت:　　کم کہے کو زیادہ جانیں۔(30)

عربی کہاوت:　　قس علیٰ هذا۔(31)

اب یہ دونوں کہاوتیں اپنی اپنی ثقافت اور لسانی تغیرات کے ساتھ موجود ہیں۔ مفہوم، معانی اور مطالب تو ایک ہی جیسے ہیں مگر دونوں میں لسانی فرق بہر حال موجود ہے۔ایک تو اس کہاوت میں علمی پہلو بھی ہے کہ علم والے اپنے علم کی وجہ سے مکمل بات کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور اپنے وقت کے ساتھ ساتھ دوسروں کا وقت بھی بچاتے ہہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ کہاوتیں کسی کو اشارۃً بھی بہت کچھ سمجھاتی ہیں کہ تھوڑے کہے کو زیادمان اور جان لیا جائے۔

ان کہاوتوں کا فائدہ علمی ہے کہ کسی کیفیت یا حال احوال وغیرہ کو، یا کسی سے شکوہ شکایت کو بھی کم کہہ کر زیادہ بتایا جا سکتا ہے کہ سننے والے کو کہا جائے کہ قس علیٰ ہذا، کہ اسی جیسی باتوں کو مزید قیاس کرلو کہ میں زیادہ بھ کہہ سکتا تھا مگر میں نے کہا نہیں اور میرے کم کہے کو زیادہ جانو۔ دیکھیں کتنی خوبصورتی سے اردو اور عربی دونوں کہاوتوں کا مطلب کو دبخود ایک جملے میں در آیا ہے۔ عربی اور اردو دونوں کہاوتوں میں اشتراکات ہی ہیں افتراقات نہیں ہیں۔

ہمیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کہاوتوں یا ضرب الامثال کی اہمیت جہاں زبان وبیان کے لیے اہمیت کی حامل ہے وہاں پر کسی ثقافت اور جغرافیے اور وہاں کے لوگوں کے لیے بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جہاں ہماری تقریر و تحریر کہاوتوں سے سج جاتی اور خوبصورت ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ بات کا معنی و مفہوم نہایت بلیغ ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی قابلِ توجہ

بات ہے کہ لوگوں کا رہن سہن اور رہتا کے ساتھ ساتھ وہاں کی بودوباش، رسومات اور روایات کے ساتھ وہاں کے علوم وفنون بھی سامنے آتے ہیں۔

یہ کہاوتیں ہی ہیں کہ جس سے ہم بڑی آسانی سے کسی بھی علاقے یا خطے کی ثقافت کو بخوبی سمجھ اور جان سکتے ہیں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہاں کہاں ابھی تک رسومات اور رواجات کے نام پر توہمات موجود ہیں اور کہاں کہاں لوگوں کا استحصال کرنے اور انھیں گھیرنے اور دھوکا دینے کے لیے ضرب الامثال کے نام پر جھوٹ پھیلا کر اساطیری طور پر جال بچھایا جا رہا ہے۔اس طرح جہاں کہاوتوں کی وجہ سے شعور، علم اور دانش عام ہوتے ہیں اسی طرح لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔اس لیے کہاوت خود میں ایک مکمل اکائی اور دانائی کا منھ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر، پیش رس، مشمولہ: اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، ازیونس اگاسکر، ڈاکٹر، نشریات اردو بازار، لاہور، 2011ء، ص9

2۔ زیب النساء علی خان / مہرداد علمداری (مرتبین)، مشترک ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2005ء، ص14

3۔ أیضاً، ص35

4۔ أیضاً، ص43

5۔ أیضاً، ص44

6۔ أیضاً، ص51-52

7۔ خلیق احمد صدیقی (مرتب)، کہاوتوں کی کہانیاں، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، 2021ء، ص24

8۔ أیضاً، ص319

9۔ احمد حسین خان، نواب، گلدستہ امثال، نظامی پریس، لکھنو، س ن، ص41

10۔ حضرت علی صاحب، مفتی، قاموس المعنون، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، 2011ء، ص552

11۔ کہاوتوں کی کہانیاں، ص360

12۔ مشترک ضرب الامثال، ص105

13۔ اَیضاً، ص13

14۔ کہاوتوں کی کہانیاں، ص359

15۔ مشترک ضرب الامثال، ص16

16۔ کہاوتوں کی کہانیاں، ص87

17۔ مشترک ضرب الامثال، ص75

18۔ اَیضاً، ص18۔19

19۔ اَیضاً، ص21

20۔ اَیضاً، ص23

21۔ اَیضاً، ص24

22۔ اَیضاً، ص14

23۔ اَیضاً، ص14

24۔ اَیضاً، ص37

25۔ اَیضاً، ص24

26۔ حضرت علی صاحب، مفتی، قاموس المعنون، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، 2011ء، ص552

27۔ اَیضاً، ص554

28۔ اَیضاً، ص557

29۔ اَیضاً، ص557

30۔ کہاوتوں کی کہانیاں، ص175

31۔ مقبول الٰہی، اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1996ء، ص136

باب سوم: عربی اور اردو ضرب الامثال کے ثقافتی عناصر کا مطالعہ

(اعتقادی ثقافتی تناظر میں)

ثقافت کی جڑیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ثقافت کو بننے میں صدیاں لگتی ہیں اور یہ خود میں بھی اتنے بڑے بڑے اتار چڑھاؤ اور اونچ نیچ کا شکار ہوتی ہے کہ انھیں اتار چڑھاؤ اور اونچ میں ثقافت کئی دفعہ بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ جس وجہ سے یہ ثقافت زیادہ سے زیادہ مضبوط اور پرانی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں کئی کئی قصے کہانیاں اور لوک داستانیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ پھر یہی لوک داستانیں اور قصے کہانیاں زباں زدِ خاص وعام ہو جاتی ہیں اور انھیں کے ساتھ کئی ایک اساطیری معاملات اور باتیں بھی جڑ جاتی ہیں۔ لوگ ہر ایک کہانی کے اپنی طرف سے ایک کہانی جوڑ لیتے ہیں اور پھر ان کہانیوں کی تائید اور رد میں کئی ایک کہانیاں جنم لینے لگتی ہیں۔ لوگ بلی کے راستا کاٹنے پر اس راستے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بچہ چھوٹا ہو تو اس کے نزدیک کوئی لوہے کی چیز رکھ دیتے ہیں کہ شیاطین اور جنات بچے سے دور رہیں۔ اسی طرح عرب کلچر میں ایسی توہمات اور اساطیری کہانیاں مشہور تھیں کہ مقتول جب قتل ہوتا ہے تو اس کے سر میں سے ایک پرندہ نکلتا ہے اور وہ اس وقت تک چلاتا اور اڑتا رہتا ہے جب تک اس کے قاتل کو مار نہ دیا جائے۔ ایسی باتیں قاتل سے انتقام لینے کے لیے رسوم وروایات میں شامل ہو گئی تھیں۔ صحرائی مرد جفاکش ہوتے ہیں۔ عربی بات کے پکے اور وعدے کے سچے ہوتے ہیں۔ یہ باتیں قبائیلی نظام کو مضبوط اور قائم رکھنے کے لیے مشہور تھیں۔ مگر کب سے اور کن لوگوں نے ایجاد کیں کسی کو معلوم نہیں کہ ثقافتیں یوں ہی آباد ہوتی

اور بگڑتی رہتی ہیں۔ فرشتے مدد کو آتے ہیں، خدا بہادروں کی مدد خود کرتا ہے۔ عربوں میں یہ باتیں بالکل عام تھیں کیوں کہ وہ لڑنے، مرنے اور مارنے پہ ہی تلے رہتے تھے۔

یہ اور اس طرح کی کئی باتیں اور واقعات ثقافتوں میں رائج ہو جاتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑے بزرگوں کے دیکھا دیکھی نیچے نئی نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور جیسے جیسے کوئی چیز یا بات یا واقعہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا ہے تو وہ عقیدے کا رنگ لینے لگتا ہے اور اس میں عقائد، رسوم، رواج، روایت یا پھر اساطیری معاملات کی پختگی آ جاتی ہے۔ کئی کئی توہمات بھی مذہب اور عقیدے کا روپ دھار کر ہماری نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں جنھیں نکالنا یا چھوڑنا ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔

اردو داں طبقے کے اندر عرب طبقے کے اندر ایک بات ہمیشہ مشترک رہی ہے کہ دونوں کے ہاں بتوں کی پوجا کی جاتی رہی ہے اور اردو والوں کے ہاں تو اب بھی کی جاتی ہے۔ ہندوستان ہو یا پاکستان دونوں جگہوں پر اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور دونوں کے ہاں بتوں کی عبادت پائی جاتی ہے۔ اس لیے بھی عقائد میں اسطورہ کا عمل دخل دیکھنے کو ملتا ہے۔ رسوم نے علاقائی ہونے کے باوجود مذہبی رنگ اختیار کر لیا ہے جس سے ان رسوم کا ادا کرنا اتنا ضروری ہے جتنا کہ جینے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اس بابت کیا خوب کہا ہے:

"اردو کی شناخت کے ابتدائی دور ہی سے اس زبان نے عربی و فارسی کے اثرات بول چال کی سطح پر بے تکلف قبول کرنا شروع کر دیے تھے، اس کی کہاوتوں میں ان کا کھلا عمل دخل اسی فراخ دلان لین دین کا شاہد ہے۔"(1)

مندرجہ بالا پیراگراف سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عربی کا اردو کے ساتھ کیسا اور کتنا قریبی تعلق ہے۔ اردو زبان کو تو عربی و فارسی کے ساتھ مذہبی و روحانی تعلق بھی ہے کہ اردو کا اسکرپٹ بھی عربی سے ملتا ہے اور گرامر بھی عربی سے ہی ماخوذ ہے۔

اعتقادی طور پر ہم کسی ثقافت کے عناصر کو دیکھتے ہیں تو ان میں اساطیری، توہماتی اور مذہبی عناصر در آتے ہیں۔ اسی لحاظ سے یہاں انھیں عناصر کے لحاظ سے کہاوتوں پر نظر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ اردو اور عربی کہاوتوں میں ان معاملات پر کہاں کہاں اشتارکات وافتراقات موجود ہیں اور ان کا پس منظر کیا ہے۔

الف: اعتقادی ثقافتی تناظر میں عربی و اردو ضرب الامثال میں مذہبی رسومات، توہمات

اعتقاد کا معاملہ جتنا سیدھا نظر آتا ہے اتنا ہی پیچیدہ اور نہ سمجھ آنے والا ہے کہ اس کا تعلق دلی جذبات اور کیفیات کے ساتھ ساتھ غیر متزلزل ذہنی و عقلی معاملات سے بھی ہے۔ عقیدہ آپ کو اندھا بھی بناتا ہے اور اپنے زندر کی روشنی سے دنیا کو پرکھنے کا سلیقہ اور شعور بھی بخشتا ہے۔ اسی لیے یہ ایک وقت میں بھی دورخی سوچ کا حامل نظریہ ہوتا ہے۔ عقیدے کی پختگی اور دنیا و آخرت میں کامیابی کی نوید کی وجہ سے ہم وہ وہ کچھ کر گزرتے ہیں کہ جن کو عقل تسلیم نہیں کر رہی ہوتی، مگر ہم

کرتے چلے جاتے ہیں۔یہی چیزیں اور معاملات عقیدے میں توہم پرستی اور مختلف روایات کو جنم دیتے ہیں کہ جن کا عقل ذہانت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذہبی رسومات، روایات یا توہمات میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہو جاتی ہیں کہ جن کا تعلق مذہب سے ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ مگر یہ بہت دیر بعد جا کر علم ہوتا ہے اور وہ بھی سارے لوگوں یا ماننے والوں پر اس کا ادراک نہیں ہوتا بلکہ چند ایک علمی و تنقیدی سوچ رکھنے والے ہی اس نکتے پہ پہنچ پاتے ہیں۔

عربی معاشرے اور رسم و رواج پا جانے والی بہت سی چیزیں اسلام کے آنے کے بعد یا یوں کہہ لیجیے کہ قرآن کی آمد کے بعد شروع ہوتی ہیں اور قرآنی آیات، اساطیر، قصص سے بھی بہت سی کہاوتوں اور ضرب الامثال نے جنم لیا ہے۔یعنی قرآن میں آنے والی کسی بھی کہاوت یا ایسی قیمتی بات جو عوام اور لوگوں سب کے لیے لوک دانش کا درجہ اختیار کر جائے اسے من و عن اپنا لیا جاتا ہے اور اپنایا گیا ہے۔ پھر اردو معاشرے میں بھی اسی کا ترجمہ رائج رہا ہے اور صدیوں سے ویسا ہی چلا آتا ہے۔ کیوں کہ ایک طرح سے اردو بھی مذہب اسلام ہی کی پرچارک زبان ہے اور یوں کہہ لیا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ہندوستان میں عربی کی ذیلی معنوی شاخ اردو ہی ہے۔ جس نے عربی کے بہت سے خیالات اپنے اندر یعنی اردو میں سمو لیے ہیں۔

اردو اور عربی کی دو کہاوتیں ایک ہی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے دیکھیے:

اردو کہاوت: اپنی بساط سے بڑھ کر کوئی کام نہیں کر سکتا۔

عربی کہاوت: لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔(2)= کل ذي حولٍ لا بد منه

عربی کہاوت کو دیکھتے ہی فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ہے اور قرآن کے نزول کے بعد اس کا چلن عام ہوا اور اسی طرح اردو کہاوت اسی کا ترجمہ ہے اور اس کا چلن اردو میں کئی صدیوں بعد ہی ہوا ہو گا۔ مگر جب دونوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دونوں کے مفہوم میں ثقافتی سطح پر کافی فرق ہے۔ یعنی عربی والی کہاوت کو جب بھی دیکھا جائے گا تو اس کا پس منظر بھی نظر میں رہے گا اور اس کا مفہوم بدل کر ایسا ہو جائے گا کہ خدا کسی پر بھی اس کی حیثیت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا اور یہی مذہبی حوالہ اسے تسکین اور سکون بہم پہنچائے گا۔

مگر جب اردو کو اس کی ثقافتی معاشرت میں دیکھیں گے تو معاملہ تھوڑا سا مختلف ہو جائے گا اور ہمیں اندازہ ہو گا کہ معنی یہاں تک مختلف ہو چکا ہے کہ ایک طرح سے ہمت ٹوٹتہ ہوئی نظر آئے گی کہ کوئی بھی شخص اپنی حیثیت یا اوقات یا ہمت سے بڑھ کر کام نہیں کر سکتا۔ اس سے انسان کے اندر کاہلی، سستی اور کام چوری پیدا ہونے کا شائبہ ہے۔

اس مذہبی تصور اور مذہبی رنگ کی وجہ سے اس کہاوت کو ایک زبان یا ایک ثقافت سے دوسری ثقافت اور زبان میں پہنچنے میں جو دقت اٹھانی پڑی ہے اس سے کہیں زیادہ خفت اسے معنوی سطح پر اٹھانی پڑی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب کہاوتیں مختلف ثقافتوں میں اپنی دانش کے ساتھ پہنچتی ہیں تو وہ اپنی جنم کردہ زمین سے مختلف زمین پت پہنچ کر اپنے معنی بھی اسی انتقال شدہ زمین کے تصورات اور ثقافت میں ڈھال لیتی ہیں۔

کچھ چیزیں ایسی مذہب میں داخل ہوئیں کہ جو اچھی ہوتی ہوئی بھی ہمیں نقصان پہنچا جاتی ہیں۔ ہم ایسے یقین کا مرکز انھیں مان لیتے ہیں کہ اپنی ذات، شخصیت اور انا کے ساتھ ساتھ اپنا اشرف المخلوقات ہونا بھی بھول جاتے ہیں۔ اس بات میں کس کو

شک ہو سکتا ہے یا کوئی دورائے دے سکتا ہے کہ خدا اس کائنات کا نظام چلانے والا تن تنہا مالک ہے۔ مگر یہ ایک مذہبی سوچ ہے اور یہی مذہبی سوچ عمل کی راہ میں ایک توہم بھی بن جاتی ہے کہ جو کر رہا ہے وہ خدا کر رہا ہے تو لہٰذا میرا اچھا برا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور میں کچھ کروں یا نہ کروں سب اسی کی توفیق سے ہے تو یہاں یہی بات ایک توہم کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور ہر قسم کے توہم سے بچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی مرض یا مریض سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ کیوں کہ روح کی بھی غذا ہوتی ہے جو کہ ایک سچا سچا عقیدہ ہی ہو سکتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ آپ خدا کو ایسے مانیں جیسے اسے ماننے کا حق ہے اور خدا تو ہمیں محنت کا درس دیتا ہے نہ کہ اپنی ک ہمتی کو خدا کی خدائی کا نام دینے کا۔ اس بارے عربی اور اردو میں کہاوتیں ہیں:

اردو کہاوت: خدا کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی درخت سے نہیں گرتا۔

عربی کہاوت: العبد يدبر والله يقدر۔(3)=اعمل بجد واترك الباقي على الله / إذا كنت تتدبر الأمور فالله يقدر النتائج

اردو کہاوت کا مطلب تو واضح ہے مگر عربی کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ عبد یعنی انسان تدبیر و کوشش کرتا ہے اور خدا تقدیر بناتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ثقافتی سطح پر دونوں کہاوتوں کے مفاہیم میں فرق آجائے گا۔

اردو میں سیدھا سیدھا یہ کہا جا رہا ہے کہ انسان کا اس کائناتی عمل اور کارگزاری میں کوئی بھی اور ذرا بھی عمل دخل نہیں ہے بلکہ ساری کی ساری کائنات خود خدا چلا رہا ہے اور انسان اس میں عبثِ محض ہے۔ مگر عربی میں تھوڑی سی گنجائش نکل آتی ہے کہ جب عربی کلچر میں کہا جاتا ہے کہ آپ اونٹ کو پہلے باندھیں پھر خدا کے سپرد کریں تو اس کہاوت یعنی ضرب المثل میں

بھی ایسا ہی کچھ کہنے کو مل رہا ہے کہ انسان تدبیر کرے گا تو خدا اس کی تقدیر بنائے گا۔یہ ایک عمل کی طرف رغبت اختیا ر کرنے والی خبر اور کہاوت ہے۔

اس کا ایک مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو ثقافت میں انسان کو زیادہ تر وہی دین اور مذہب کی سمجھ مل سکی ہے جو تراجم کے ذریعے سے یہاں کے لوگوں تک پہنچی ہے مگر اور انھوں نے وہی اپنالی ہے مگر عربی والوں نے بلاواسطہ عربی متن کو پڑھ کر دین کی تفہیم حاصل کی ہے۔لسانی تغیرات اور تراجم بھی کہاوتوں کی تفہیم پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اب یہ کہاوت خصوصاً اردو والوں کے نزدیک ایک توہم کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ لوگ ہر معاملے میں تدبر اور سوچنے کی بجائے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرفف سے ہوا ہے اور خدا ہر کا بہترین ہی کرتا ہے۔اس سے تدبر کی بجائے بے فکری اور عمل کی بجائے بے عملی کی ترغیب پھیلتی ہے۔

مذہبی روایات کو دیکھیں تو ہمارے ہاں یعنی اردو اور عربی دونوں کے ہاں آبِ زم زم کو بہت پاکیزہ سمجھا جاتا ہے۔لوگ حج یا عمرہ کرنے جاتے ہیں تو وہاں سے زم زم کا پانی لے کر آتے ہیں کہ اس سے شفا ملے گی،ثواب ملے گا اور ایسی ہی کئی ایک توہمات اور اساطیری کہانیاں ہم نے مذہب کے نام سے اس کے ساتھ جوڑلی ہیں۔ حتیٰ کہ ہم میں اکثر لوگ تو آبِ زم زم سے اپنا کفن دھو کر اپنی زندگی میں ہی سنبھال کر رکھ لیتے ہیں اور وصیت کرتے ہیں کہ ہمیں اسی پاکیزہ کفن میں دفنایئے گا۔اگرچہ ہم سب جانتے ہیں کہ اعمال ہی انسان کی پاکیزگی اور نفاست کے ساتھ ساتھ اچھے اور برے کا فیصلہ کریں

گے۔لوگ آبِ زم زم سے مسجدیں اور مزارات بھی دھوتے ہیں۔اسی لحاظ سے لوگ اپنے گناہ دھونے کے لیے بھی زم زم سے غسل کرتے ہیں۔تاکہ گناہوں کاازالہ ہوسکے۔مگر ایسا ہوتا نہیں۔اسی پر کہاوت ہے:

اردو میں کہاوت: آبِ زم زم سے نہانے سے کوئی مومن نہیں بن جاتا۔

عربی میں کہاوت: الکلب کلب و لو طوقتہ بالذھب۔(4)

اردو کہاوت میں تو باقاعدہ طور پر مذہبی رسم اور پھر اسی رسم کو ایک توہماتی سطح پر بھی دیکھا جاسکتا ہے مگر عربی کی کہاوت مفہوم اور مطالب میں تو ویسی ہی ہے مگر الفاظ اور معنی میں تھوڑا فرق ہے جس سے عربوں کی ثقافت بھی واضح ہو ہو جاتی ہے۔

اردو میں تو سیدھا بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی شخص بھی پاکیزہ نہیں ہو سکتا،مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خود کوئی نیک اعمال نہ کرے یا پھر نیکی کی راہ نہ اپنائے۔مگر عربی میں کہا گیا ہے کہ کتا کتا ہی رہتا ہے چاہے وہ سونے کا طوق یعنی پٹا ہی کیوں نہ پہن لے۔

اب دونوں کہاوتوں میں ثقافتی سطح پر جو فرق ہے وہ قابلِ دید ہے کہ آبِ زم زم سے نہانا اور خود کو نیک سمجھنا یہ زیادہ تر مسلم ممالک میں ہندوستان میں ہی پایا جاتا ہے باقیوں میں نسبتاً کم ہے۔اس لیے یہاں پر یہ مثال دے کر بتایا گیا کہ کوئی بھی آبِ زم زم سے نہانے کے باوجود بھی نیک نہیں کہلائے گا جب تک وہ نیکی کرے گا نہیں۔مگر عرب میں چوون کہ سونے کی نمائش

بہت عام تھی اور کتوں سے شکار کرنے کی بھی روایت موجود تھی اس لیے وہاں پر دونوں طریقوں کو اکٹھا کر کے عرب ثقافت کی گہری بات کو نشانہ بنایا گیا ہے کہ کتا تو کتا ہی رہے گا چاہے وہ سونے کا طوق پہن کر بھی شکار کرے۔

اب دونوں کہاوتوں کو معنوی سطح پر دیکھیں: کہ گناہ گار تو گناہ گار ہی رہے گا چاہے وہ ہزار دفعہ زم زم کے پانی سے وضو کرے یا پھر غسل کرے۔ اسے اس کے اعمال ہی نیک یا بد بنائیں گے۔ اب ذرا کتے کی بابت دیکھیے: کتے سے مراد اگر انسان لیا جائے اور سونے سے مراد مالو دولت یا پھر نیکی کا معیار مقرر کر لیا جائے تو پھر؛ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جتنا مرضی کوئی کتا نیک ہو جائے وہ کتا ہی رہے گا، یا کوئی شخص اگر دل کا کمینا یا نگاہ کا تنگ ہے تو وہ ظاہری جتنا مرضی سونا پہنے یا مال و دولت کی نمائش کرے اسے اس سے فائدہ پہنچنے والا نہیں کہ سونا بھی اسے قیمتی نہیں بنا سکتے۔ جیسے کتا کتا ہی رہے گا اسی طرح کمینا شخص کمینا ہی رہے گا۔ بد ذوق بد ذوق ہی رہتا ہے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔

دونوں کہاوتوں میں معانی، مطالب اور مفاہیم اپنی اپنی ثقافت کے فرق کے ساتھ دلچسپ اور اہمیت کے حامل ہیں۔

کئی ایک مذہبی رسمیں تو ایسی ہیں کہ باقاعدہ قانون کی شکل اختیار کر گئی ہیں اور کچھ تو قانون ہیں اور اب کہاوتوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اسلام میں چوں کہ خدا کا بنایا قانون ہی رائج العمل ہوتا ہے اس لیے قرآنی قوانین ہی اسلام کے قوانین کہلاتے ہیں۔ کچھ قوانین اور شرائط اس قدر واضح ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ محاوروں اور قوانین کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ جیسے؛ جب کسی سے بدلہ لینا ہو تو برابری کی مثال دینے کے لیے ہم قصاص والی آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ سچی اور سیدھی بات کہنے پر بھی قرآنی حوالے ہی پیش کرتے ہیں اسی طرح تدبر اور ایسی کئی ایک عباداتی معاملات پر بھی قرآنی حوالے ہی

پیش کرتے ہیں۔ یہ قرآنی حوالے اس قدر عام ہو جاتے ہیں کہ ان پڑھ آدمی بھی اسے برتنے لگ جاتا ہے اور اس طرح کہاوت وجود میں آنے لگتی ہے۔ اردو اور عربی دو کہاوتیں دیکھیں کہ جن سے مذہبی رسم وروایات واضح طور پر سامنے آئیں گی؛

اردو میں کہاوت: آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جی کے بدلے جی۔

عربی میں کہاوت: اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔(5)

بنیادی طور پر اردو اور عربی دونوں قرآن کی ہی آیات ہیں، یعنی اردو الا بھی اسی آیت کا ہی ترجمہ ہے اور قرآنی اصول کے مطابق تو اسے قصاص کہا جاتا ہے۔ کہ جس شخص کا جو نقصان ہوا ہے وہ اسی کو پورا کر سکتا ہے اگر ایسا نہیں ہو گا تو معاشرے میں انتشار پھیلے گا اور جس کے من میں جو آئے گا وہ وہی کرے گا اور نقصان قصاص سے بڑھ کر کہیں آگے چلا جائے گا۔ کئی جانی مالی نقصان ہو جائے گا۔

آنکھ کے بدلے آنکھ اور جی کے بدلے جی سے مراد یہ کہاوت اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب کسی سے بدلہ یا انتقام لینا مقصود ہو۔ اور اسی وجہ سے قصاص والی آیت جو کہ اپنے استعمال کی بدولت اب ایک کہاوت اور ضرب المثل کی سطح تک پہنچ چکی ہے، بولی جاتی ہے کہ حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی پنا حق ناحق چھوڑ دینا چاہیے۔

عربی میں تو یہ ایک قرآنی آیت ہے تو ظاہر ہے کہ یہ معاشرے کے بگڑے معاملات کو سدھارنے کے لیے ہی اتری ہو گی تا کہ معاملات جو عام زندگی میں اس قدر بڑھ چکے تھے کہ لوگ اتنا لڑتے جھگڑتے تھے کہ کئی کئی نسلووں تک بدلے کی آگ اور انتقام کی آگ میں جلتے رہتے تھے۔ یہ رسم تھی کہ بدلہ لینا ہی اصل مردانگی ہے اور اصل زندگی تو سر اٹھا کر جینے میں ہے اور سر اٹھا کر جینے کے لیے اپنے دشمن، اپنے اسلاف کے دشم کو مارنا بہت ضروری ہے۔

یہ قصاص والا معاملہ اسی لیے سامنے آیا کہ جہاں ایک آدمی کا نقصان ہونا ہو وہاں بس ایک ہی آدمی کی جان جائے نہ کہ پورے کے پورے قبیلے کو دشمنی اور انتقام کی آگ میں جھلسا دیا جائے۔

یہ کہاوت تو اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ اسے برتتا ہے۔ اردو میں بھی یہ کہاوت بالکل اسی معنوں میں استعمال ہوئی ہے جیسے عربی میں استعمال ہووئی ہے۔ ظاہر ہے یہ عربی زبان کا ہی اثر اور اسلام کی برکت سے قرآن کا اعجاز ہے کہ دوسری کئی زبانوں نے قرآنی تلمیحات، واقعات اور اساطیر کے ساتھ ساتھ اسلامی مذہبی رسوم وروایات کو اپنایا ہوا ہے۔ یہ آیت ایک بہت بری عرب معاشرے کی رسم کی قاتل بن کر سامنے آئی۔

یہ ہم جانتے ہیں کہ کام وہی اچھا ہوتا ہے کہ جو مکمل کیا جائے وگرنی ایک نیکی کا کام بھی اچھا یا احسن نہیں اگر وہ مکمل نہیں کیا گیا اور راستے میں ہی نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسا تقریباً دنیا کی ہر قوم اور ہر خطے کی ثقافت میں پایا جاتا ہے کیوں کہ اس کا تعلق عام انسانی سوچ اور شعور سے ہے۔

اسی لیے عربی اور اردو دونوں زبانوں کی کہاوتوں میں ایسی کہاوتیں پائی جاتی ہیں۔

اردو کہاوت: الاکرام الاتمام

عربی کہاوت:خیر الأعمال بالأکمال-(6) إنما الأعمال بخواتمها

ان دونوں کہاوتوں کا شمار بلاشبہ مذہبی رسومات میں ہوتا ہے کہ آدمی جو کام کرے اسے مکمل کر کے چھوڑے تو ہی اس کا فائدہ ہے یا وہ کام کسی کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ عربی میں تو اس کے لیے اور بھی کہاوتیں بولی جاتی ہیں مثلاً اتبع الفرس لجامها والناقة زمامها، یا پھر ایک اور کہاوت الاحسان بالاکمال، یعنی کل ملا کر ہم کہ سکتے ہیں کہ اچھا، بھلائی کا اور خیر کا کام وہی ہے کہ جس میں کام کو تکمیل تک پہنچایا جائے نہ کہ وہ کام جو ادھورا چھوڑ دیا جائے یا کسی کے انتظار میں مکمل نہ کیا جائے۔ عربی ثقافت میں تو یہاں تک بھی ہے کہ احسان بھی وہی ہے جو مکمل کیا جائے۔ گھوڑا یا اونٹنی بھی وہی قابلِ استعمال ہے یا سواری کے قابل ہے کہ جس کو تیار کر کے اسے لگام دال دی جائے نہ کہ بس کاٹھی رکھ کر چھوڑ دیا جائے اور سواری کے وقت وہ ہاتھ ہی نہ آئے یا پھر بھاگ جائے۔

مذہب میں تو ویسے بھی اکرامِ مسلم یا دوسروں کی خدمت کو بہت اہمیت دی گئی ہے کہ دوسروں کے اکرام کا خیال رکھیں، ان کی خدمت کریں تو اس لحاظ سے بھی اسے مذہبی رسم میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ اکرام جب بھی کریں مکمل کریں وگرنہ اکرام مصیبت بھی بن سکتا ہے۔

نہت سی مذہبی رسمیں ایسی ہیں کہ جو کہاوتوں کی شکل میں ہم میں موجود ہیں۔ یا پہلے کبھی وہ مذہب میں سامنے آئیں اور بعد میں انکے استعمال نے انھیں عوامی بنا کر کہاوتوں تک کی دانش میں منتقل کر دیا۔ جیسے وعدے کی پابندی، سچ بولنا، ایمانداری

دکھانا، حسنِ سلوک کرنا یا کسی اور طرح کی نیکی جو آہستہ آہستہ عوام میں اس طرح رائج ہو گئی کہ عوامی سطح پر بھی اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی اور وہ عام استعمال میں آتی چلی گئی۔

انھیں باتوں میں ایک وعدے کی پابندی بھی ہے کہ ہر مذہب اور مہذب معاشرے نے دوسروں کے ساتھ کیے گئے وعدے پورے کرنے پہ بہت زور دیا ہے۔ اس پر کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: الکریم اذا وعدہ وفا۔

عربی کہاوت: الكريم إذا وعد وفا وإذا توعّد عفا ـ(7) =الكريم إذا وعد وفي وإذا توعد أجاب

یہ بنیادی طور پر عربی کی ہی کہاوت ہے مگر اردو میں بھی ایسے ہی استعمال ہوتی ہے۔ کہ کریم وہی ہے جو اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں باواعدہ وعدے کی پابندی کی بات کی ہے اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 35 میں کہا گیا ہے: وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ‌ۚ-اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۔ اس کا مطلب ہے کہ وعدہ پورا کرو کہ وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وعدے سے متعلق کوئی کہاوت کا اس طرح عام ہو جانا بالکل مذہبی رسم میں آتا ہے اور یہی کسی مذہب یا کہاوت کا کام ہے کہ اس کی دانش عوامی سطح پر پہنچ جائے۔

عربی اور اردو دونوں میں چونکہ مذہب اسلام کا بول بالا ہے تو لازم ہے کہ دونوں میں اس کہاوت کا اطلاق ایک ہی طرح ہو نہ کہ اس کے افتراقات و اشتراکات سامنے آئیں۔

اسی طرح ایک اور کہاوت ہے جو بنیادی طور پر اسلام رسم کا درجہ رکھتی ہے مگر اردو اور عربی میں ایک ہی طرح استعمال ہوتی ہے۔

اردو کہاوت: جسے حیا نہیں اسے ایمان نہیں۔

عربی کہاوت: الحیاء من الایمان۔(8)

اب ہم کو معلوم ہے کہ یہ جملہ جو کہاوت یا ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے، یہ ایک حدیث ہے، جو یقیناً ہمارے لیے مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کہاوت کو ہم نے مذہب سے ہی لیا ہے اور یوں یہ ہماری ثقافتی روایت میں مذہبی رسم کے طور پر بھی مانی اور یقین کی جاتی ہے۔ اور روایت یا رسم تو ہوتی ہی ہے کہ جس سے احتراز کرنا یا پیچھا چھڑانا بہت ہی مشکل ہو اور وہ ہماری نسلوں میں سرایت کر چکی ہو۔

اب ہمارے معاشروں میں یعنی عربی اور اردو دونوں معاشروں میں اس حدیث پر یوں عمل کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی کہاوت ہو اور ہر جگہ بولی بھی ایسے ہی جاتی ہے مگر جہاں مذہبی حوالہ دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ حدیث ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ مذہبی رنگ کی رسم بنیادی طور پر دین کا حصہ تھی۔ کہاوتوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اس تکرار اور تسلسل سے بولی جاتی ہیں کہ وہ عوام میں نچلی سطح تک پہنچ کر ثقافتی عناصر کو اپنے آپ میں ضم کر لیتی ہیں اور لوک دانش کا حصہ بن کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس مذہبی رسموں پر مبنی کہاوتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ دونوں معاشروں میں یہ کہاوت حدیث ہونے کی وجہ سے ایک ہی ثقافتی پہلو سے اپنا مفہوم ادا کرتی ہیں۔

پہلے بھی کئی کہاوتوں اور ضرب الامثال کا ذکر ہو چکا کہ کئی ایسی ضرب الامثال ہیں کہ جن میں کا ے علق مذہب سے ہے مگر وہ معاشرے میں عوام میں مذہبی رسوم کے طور پر کہاوتیں مشہور ہو گئیں۔ اس لحاظ سے ایک اور ضرب المثل دیکھیے:

اردو کہاوت: پاکیزگی نصف ایمان ہے۔

عربی کہاوت: النظافة من الایمان۔(9)

اردو اور عربی ضرب الامثال دونوں ہی ایک مفہوم اور معنی ادا کر رہی ہیں دونوں کی لفاظی بھی ایک ہی ہے۔ دراصل یہ اسلامی شعائر میں سے ہے جو اپنے استعمال اور چلن کے باعث عوام میں ضرب المثل یا کہاوت کے طور پر رائج ہو چکی ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص ایسا نہیں ملتا دونوں ثقافتوں عربی اور اردو میں کہ جسے اس کہاوت کا پتا نہ ہو اور بہت سے تو اس کہاوت کو بطور مذہبی جملے یا حدیث کے طور پر بولتے ہیں مگر لوک دانش کی سطح پر پہنچنے کی وجہ سے یہ ایک کہاوت کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

اردو والے بعض اوقات اسے پاکیزگی کی جگہ پر صفائی بھی بول دیتے ہیں یعنی صفائی نصف ایمان ہے۔ ظاہر ہے کہ نظافت کا مطلب صفائی ہی ہے۔ یہ کہاوت صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے صدقے سے اردو میں پہنچی ہے اور اردو والوں نے اسے ایسے ہی اپنالیا ہے اور اب یہ ایک مذہبی اسلامی اصول کے طور پر بھی مانی اور جانی جاتی ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر اس کی مثال کسی اور بھی اسلامی زبان اور خطے سے لی جائے تو اندازہ ہو گا کہ یہ عربی سے ہی اردو یا اس اسلامی کلچر میں پہنچی ہے یعنی اگر ہم فارسی میں دیکھیں تو:نظافت از ایمان است(10)۔

اب فارسی کی مندرجہ بالا کہاوت سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کہاوت اسلامی مذہبی رسم اور شعائر کے طور پر اسلامی ملکوں میں رائج ہے اور اسی طرح اس کا استعمال ہوتا ہے۔ دونوں کہاوتوں کے ثقافتی رنگ میں فرق نہیں ہے کیوں کہ دونوں کے پیچھے محرک ایک ہی فکر ہے یعنی اسلامی فکر۔

اردو اور عربی دونوں زبانوں میں مقامی رسم ورواج اور اس کے علاوہ مذہبی شعائر کو بھی ضرب الامثال میں جگہ جگہ استعمال کیا جاتا ہے، جس کی مثالیں مل جاتی ہیں اور اوپر بھی کئی ایک بیان ہو چکی ہیں۔

اردو زبان یعنی ہندوستان میں بھی مسلمانوں کا دور دورہ اور حکومت صدیوں تک رہی ہے اس لیے اسلامی شعائر اور اقدار وافر مقدار میں مل جاتے ہیں اسی طرح عربی ثقافت میں اسلامی اور مذہبی شعائر کے اثرات ضرب الامثال میں مل جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے دو ضرب الامثال دیکھیں:

اردو کہاوت: اول سلام، پھر کلام۔

عربی کہاوت: السلام قبل الکلام۔(11)

ان دونوں کو ضرب الامثال کو پڑھیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ دونوں کہاوتوں کا مطلب ایک ہی ہے اور دونوں پر مذہبی رسم کا اثر ہے اور وہ مذہبی اثر بلاشبہ اسلام ہے۔

اسلام میں بات کرنے سے پہلے ملاقات کے آداب سکھاتے ہوئے کلام کو پہلی ترجیح قرار دیا گیا ہے اس لیے مسلمان ملتے ہی خصوصی اہتمام سے سلام کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر یہ بات اتنی عمدگی اور سادگی سے اپنائی جاتی رہی اور آج بھی اپنائی اور عمل

کیا جاتا ہے کہ تمام لوگوں نے اسے بلا چون وچرا مان لیا اور اس کا استعمال پہلے دن سے ہی عام کیا اسی بنا پر یہ اسلامی اور مذہبی رسم ایک کہاوت کا درجہ اختیار کر گئی۔

ضرن المثل یا کہاوت کا تعلق عوامی اور لوک دانش سے ہوتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات چاہے مذہب کے حصے یا قصے سے آئی ہو یا پھر کسی اور تہذیبی یا علمی وسیلے سے زباں زدِ عام ہو گئی ہو مگر کہاوت بن کر وہ اس ثقافت کی بھرپور نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے علاقائی تاثر کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی فکر اور مذہبی رسم کے طور پر یہ کہاوت اردو میں مستعمل ہے مگر عربی سے بالکل اشتراک کے ساتھ کیوں کہ بنیادی طور پر یہ عربی ہی کی کہاوت ہے۔ عربی کی اسلامی اصطلاح، اردو میں کہاوت کے روپ میں ڈھل کر دونوں زبانوں کے باہمی انسلاک کی گواہ ہے۔

مذہب میں اور ثقافتی ردوبدل کی وجہ سے بہت سی ایسی قباحتیں بھی ایسی ہیں کہ جو مذہب کے نامپہ یا علاقائی تصرف کی بنا پر جغرافیے کا حصہ بن کر ثقافت میں ڈھل گئیں اور وہی پھر لوگوں کا اوڑھنا بچھونا اور ایمان بن گیا۔ جب کوئی رسم یا توہم کا حصہ ایمانی حالت تک پہنچ جائے تو اس سے جان چھڑانا بہت مشکل ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ مگر ایسی باتیں ضرب الامثال میں ڈھل جاتی ہیں اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان رسومات اور رواجات کا چلن کس قدر زیادہ اور عامیانہ سطح تک پہنچ چکا ہے۔

ایسی مذہبی یا علاقائی توہمات یا رسومات کئی ایک ہیں کہ جن کا تعلق مذہب یا مذہبی کسی فریضے سے ہے اور ہم دن رات اس کو کرتے ہوئے نہ جھجکتے ہیں اور نہ ہی اس سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ اردو عربی میں ایسی کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: مومن کے جھوٹے میں شفا ہے۔

عربی کہاوت: في سؤر المؤمن شفاء۔(12)

ان دونوں ضرب الامثال کا مطلب اور معانی ایک ہی ہیں اور دونوں کی لفاظی میں بھی فرق نہیں ہے۔اس سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ یہ کہاوت بھی عربی سے اردو ثقافت میں پہنچی ہے اور مذہبی توہم یا رسم کے طور پر رائج ہے۔

جدید سائنس اور علوم بہت کچھ ثابت کر چکے ہیں مگر ابھی تک بہت سی توہماتی باتیں اور قدیم زمانے سے چلی آ رہی رسومات ہمارے ہاں ویسے کی ویسے ہی مل جاتی ہیں۔اردو اور عربی دونوں معاشرے اور ثقافتیں تو مذہبی ہی ہیں کہ ان پر بات کرنے پر کوئی کلام یا دورائے نہیں ہیں۔

مگر سمجھنے اور جاننے والی بات جو ان کہاوتوں کے زیریں اور گہرے پہلو میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ بہت سارے مذہبی لبادہ اوڑھنے والے لوگ یا مذہبی رہنما خود کو نیک نام اور مومن ثابت کرتے ہیں۔مومن اس لیے کہ مذہب اسلام کے مطابق مومن ہی خدا کا پسندیدہ بندہ ہے مگر اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے یہ تو خدا ہی جانتا ہے مگر لوگ ظاہری عبادات یا چوغے واغیرہ پہن کر اس بات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ااس لیے جب وہ خود کو مومن ہونے کا دعویٰ کر لیتے ہیں تو پھر یہ مذہبی اصطلاح بھی ان پر آشکار ہو کر اس کے لوازمات بھی ان کو عطا کر دیتی ہے۔یعنی اگر وہ مومن ہیں تو خڈا کے پسندیدہ بندے بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر کئی ایک خوبیوں کے ان کے لعاب اور جھوٹی کی ہوئی چیز میں بھی شفا منتقل ہو جائے گی۔جس سے وہ بھولے بھالے لوگوں کو بھی بھٹکا سکتے ہیں اپنے جال میں پھنسا سکتے ہیں یا ان سے کسی بھی طرح کا کام لے سکتے ہیں مگر خود

جب بیمار ہوں گے تو اپنا علاج اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے کروائیں گے حالانکہ انھی کے لعاب میں ان کے مطابق شفا موجود ہے۔

اردو اور عربی دونوں معاشرے اس کہاوت کی زد میں آتے ہیں مگر اردو معاشرے میں اس لیے بھی اس کا استعمال زیادہ ہے کہ اردو والوں کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ یہ ایک مذہبی بات ہے یا پھر ضرب المثل ہے کہ جس سے کئی ایک معاملات اور معانی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ ایک طرح کی توہم بھی ہے جو مذہبی لوگوں نے اپنے ساتھ جوڑلی ہے حالانکہ اب سائنس بتا رہی ہے کہ ایک دوسرے کے جھوٹے میں شفا تو دور کی بات کئی ایک جراثیم کی بدولت کئی بیماریاں بھی منتقل ہو سکتی ہیں لہٰذا ایک دوسرے کے جھوٹے کھانے یا کھانے والی چیزوں سے ہرہیز ہی کرنی بہتر ہے۔ مگر مذہبی لوگ اس بات کا خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مزید بھی اٹھائیں گے۔

اگر مومن کے جھوٹے میں شفا ہو بھی تو کون فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ مومن ہے اور دوسرا مومن نہیں ہے۔ایسی مذہبی رسومات یا توہمات سے بچنا ہی چاہیے اور لوک دانش کی اس عام بات کو زیادہ احتیاط سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ایسی اور بھی بہت سی کہاوتیں ہیں کہ جن سے انسان کی ضعیف الاعتقادی یا توہم پرستی واضح ہوتی ہے۔ قسمت کے لکھے پر اکتفا کرنا اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے کہ لوگ ہر کام کو خدا یا قسمت یا پھر تقدیر کا کہہ کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور شاطر و چالاک لوگ اس پر قابض ہو جاتے ہیں یا پھر معصوم لوگوں کو تقدیر کے پیچھے لگا کر خود بچ نکلتے ہیں۔

ایسی کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: کرم کا لکھا۔(13)

عربی کہاوت: جف القلم بما ھو کائن۔(14)

مندرجہ بالا اردو اور عرب کہاوتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح رسومات میں توہمات کو بھر دیا گیا ہے کہ کوئی آدمی بھی کسی جابر کے خلاف یا اپنے حق کے لیے آواز بلند نہ کرے اور ہر کام کو مشیتِ خداوندی سمجھے اور آرام سے بنیا لوٹنے والا تمام معصوم لوگوں کو لوٹتا رہے۔

اردو کہاوت جس کا مطلب بالکل واضح ہے اسی طرح کی اردو میں اور بھی کہاوتیں زباں زدِ عام ہیں اور اکثر بولی جاتی ہیں جن میں؛ دھاؤ دھاؤ کرم کا لکھا سو پاؤ، کرم کی لیکھا امٹ ہے، روپ کی رووے بھاگ کی کھاوے(15)۔یعنی اسی طرح کی مزید کہاوتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن میں ہر طرح سے کوشش کر کے عوامی سطح پر یہ بات پھیلا دی گئی ہے کہ ہر آدمی کو وہی ملے گا جو اس کی تقدیر میں لکھا ہے مگر محنت کررنے کی یا زیادہ سے زیادہ کے لیے اپنی تقدیر بدلنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عربی میں تقدیر کے بہت مسائل ہیں اور تقدیر کے بارے میں بار بار کہا جاتا ہے کہ جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہی ملے گا اور انسان کو مزید محنت کرنے کی یا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں اوپر درج کی گئی کہاوت کا مطلب ہے: جو ہونے والا ہے اس کو لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے۔یعنی اب مزید تقدیر نہیں لکھی جائے گی۔یہ سارے نظریات لوگوں کو غلام بنانے اور انھیں

غلام بنے رہنے پہ اکسانے کے لیے ہی گھڑے گئے تھے۔ مگر اسلام نے آکر عرب میں محنت اور عظمت کی بات کی اور لوگوں کو آگے بڑھنے کی تلقین کی اور کہا: اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اس سے یہ اثر پڑا کہ لوگوں کی تقدیریں جب اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو وہ ضرور بدل سکتا ہے اور بدلے گا بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی باتیں کہ ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ محنت کرے گا۔ ایسی ہی کئی تقدیر پر غالب آنے کی باتیں ملیں اور انسان انسان کے قبضے سے آزاد ہوا۔

دونوں کہاوتوں میں تقابل کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ثقافتوں کے جابر عام عوام کو اپنے قابو میں کرنے اور رکھنے کے لیے ایسے توہماتی جملے اور کہاوتیں مشہور کرواتے تھے مگر عرب یں تو اسلام میں بدلاؤ لایا مگر ہندوستان یعنی اردو دنیا میں اس کا بدلاؤ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی پاکستان اور ہندوستان (اردو ممالک) توہمات میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

ب: اعتقادی ثقافتی تناظر میں عربی وار دو ضرب الامثال میں اساطیر

اساطیر اور مختلف کائناتی وزمانی تعبیریں کہ دنیا کیسے اور کیوں وجود میں آئے اور ایسی ہی کئی باتیں کہ مذہب کیا ہے؟ رسومات کیا ہیں اور ان کی تشریح، تعبیر اور جاننے کی غرض سے انسان نے کئی ایک باتیں خود سے وضع کرلی ہیں۔ یہ باتیں اتنی دلکش اور چٹ پٹی ہوتی ہیں کہ سب معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ ایسا ممکن نہیں مگر لوگ عقیدے یا پھر معاشرتی دباؤ اور رواج کی وجہ سے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ معاشرے میں رائج اساطیر کے کالف بولنے یا کوئی اقدام اٹھانے کی کسی کو کوئی جرآت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ایسا سوچ سکتا ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اس میں ایسی ایسی مافوق الفطرت اور خرق عادات باتوں کا اضافہ کرلیتے ہیں کہ ہر کوئی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اڑ بھی سکتا ہے یا کائنات کی تکوین اور استحکام ایک بیل کے

سینگوں پہ سہاری ہوئی ہے۔ دیواریں سنتی ہیں اور پتھر، درخت انسان سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ اسطورہ کی جڑیں بھی اتنی ہی مضبوط ہوتی ہیں جتنی کسی بھی ثقافت کی قدامت ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لینا چاہیے کہ دونوں ایک ساتھ جوان ہوئی ہوئی ہوتی ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے پانی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا؛ جو کہ ناممکن ہے۔

ایسی ہی کئی ایک رسومات اور باتیں مشہور ہو کر مذہبی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں نیکی اور بدی کا تصور پایا جاتا ہے اگر چہ دنیا میں ہر جگہ نیکی اور بدی کا تصور اپنا اپنا پایا جاتا ہے اور ہر جگہ ناسانوں کے نیک ہونے یا بد ہونے کا معیار اور طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہی ان علاقوں کی پہچان ہو پاتی ہے۔ کہیں نیکی معاشرتی حسن اور کہیں مذہب کا لازمہ مانا جاتا ہے۔

مگر ایک بات عموماً مذہبی یا معاشرتی طرز پر رائج مانی جاتی ہے کہ خبیث یا برے آدمی کے لیے بنائے گئے جوڑے بھی برے ہی ہوتے ہیں اور نیک آدمی کے لیے نیک عورت اور بد عورت کے لیے بد کردار مرد ہی حصے میں آتا ہے۔

یہ باتیں توہمات سے بڑھ کر اسطورہ کی شکل اختیار کر جاتی ہیں اور ہماری معاشرت میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائی جاتی ہیں۔ ایسی ہی کہاوتیں اردو ار عربی کیا دنیا بھر کی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اردو اور عربی میں ایسی کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت: بانکی لڑکی کا بانکا سایہ۔

عربی کہاوت: الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات ۔(16)

دونوں کہاوتوں کے مطالب اور مفہوم میں تو یکسانیت ہے مگر دونوں کی ثقافت اور لفاظی میں فرق ہے۔ اردو میں کہی گئی کہاوت؛ جس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی لڑکی یا شخص برا ہو گا تو اس کا سایہ یعنی اس سے متعلقہ ہر چیز بھی بری ہی ہو گی۔ اسی طرح عربی میں کہی گئی کہاوت دراصل قران کی آیت میں سے لیے گئے ہیں؛ کہ خبیث عورتوں کے لیے خبیث مرد ہی خدا نے بنا رکھے ہیں۔

معنوی سطح پر تو یہ کہاوتیں بہت پُر اثر اور اچھی ہیں مگر ان کو توہماتی سے بڑھ کر اساطیری سطح پر دیکھا جائے تو یہ ایک قسم کی اسطورہ ہیں اور ہم سب اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ نیک اعمال کروگے تو تمھارے ساتھ بھی نیک عمل ہی ہو گا۔ بلکہ ایک جملہ تو ہم اکثر بولتے ہیں رہتے ہیں کہ اگر انسان خود اچھا ہو تو اسے اچھے ہی انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا بھی ہے اور بعض دفعہ نہیں بھی۔

بانکا لڑکا یا بانکی لڑکی کے لیے ہمیشہ سب کچھ ٹیڑھا ہی رہے گا یعنی جیسی وہ خود ہے اس کا نصیب بھی ویسا ہی ہو گا۔ عربی میں موجود کہاوت بھی کچھ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ خبیث عورتوں کے لیے خبیث مرد ہوں گے اور خبیث مردوں کے لیے خبیث یعنی گناہ گار عورتیں ہی ہوں گی۔ یہ ایک قسم کی اسطورہ ہے یقین کرنے والے یقین کرتے ہیں اور نہ ماننے والے نہیں مانتے۔ بہر حال مذہبی معاشروں میں یہ اساطیری معاملہ بہت مشہور و معروف ہے۔

دونوں زبانوں کی کہاوتوں کو دیکھا جائے تو یہاں بھی معنوی اور حقیقی سطح پر عربی زبان آگے بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عربی چوں کہ مذہبی زبان ہے اور اس میں مذہبی حوالے ہی توہمات اور اساطیر کی سطح تک پہنچ جاتے ہیں تو معتبر بات اس

کے صحیفے کی بنتی ہے، لہٰذا قران میں آگیا ہے تو ماننے والوں کو ماننتے ہی بنے گی۔ اس کے علاوہ خبیث کہہ کر کہاوت کی معنویت اس طرح بڑھ گئی ہے کہ باقی کہنے سے وہ حیثیت سامنے نہیں آتی۔ یعنی لسانی سطح پر یہ اسطوراتی کہاوت اپنی مثال آپ ہے۔

بعض باتیں اتنی مشہور و مقبول ہو جاتی ہیں کہ خود بخود اساطیر کا درجہ اختیار کر جاتی ہیں اور نہیں معلوم کہ کون ان باتوں کو مشہور کرتا ہے اور پھیلاتا ہے اور ہر طرف ان کا چرچہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسی ہی بات ہم اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں اور پاکستانی معاشرے یعنی اردو دنیا میں بھی یہ بات ایسے ہی مقبول اور مشہور ہے کہ کوئی بھی اسے رد کرنے یا اس کے خلاف جانے کی سوچتا تک نہیں۔

بات یہ ہے کہ جیسی عوام ہو گی ویسی ہی حکومت ہو گی، یعنی بادشاہوں کا ہم پر مسلط ہونا ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کو اچھا اور نیک ہونا چاہیے تاکہ ان پر کوئی نیک حکمران آکر حکومت کرے۔ پتا نہیں یہ بات کس نے کب اور کیوں مشہور کر دی۔ بہر حال بات ایسے ہے نہیں بلکہ بات اس کے الٹ ہے کہ کس طرح عوام اور بادشاہ یا حکومتوں کا تعلق ہوتا ہے اور یہ ضرب المثل اردو اور عربی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے معاشروں اور ثقافتوں میں بھی یہ بات ایسے ہی مشہور و مقبول ہو۔ بہر حال ضرب الامثال دیکھیے:

اردو میں کہاوت: جیسا راجا، ویسی پرجا۔

عربی میں کہاوت: الناس علی دین ملوکھم ۔(17)

اس کہاوت کو اور بھی زبان اور معاشرت میں سمجھنے کے لیے دیکھا گیا تو فارسی ثقافت میں بھی یہ کہاوت ایسے ہی مشہور ہے کہ عوام اپنے حکمرانوں کے دین کے مطابق ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا دونوں کہاوتوں سے بھی یہی بات واضح ہو رہی ہے۔ اس کہاوت کا ذکر یہاں اساطیر کے مقام پہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ہم جان سکیں کہ بہت سی باتیں جو ایسے ہی دنیا ومافیہا کو سمجھنے کے لیے گھڑ لی جاتی ہیں ان کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی نہ کسی طاقت کا مظہر بن کر ہمیں ہی کنٹرول کرتے ہیں اور ایسی باتوں سے کیا اسطورہ قائم ہوتی ہے کہ جیسی عوام ویسی حکومت۔

اندازہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کس قدر چالاکی اور سفاکی کے ساتھ اس کہاوت کو بالکل ہی الٹ دیا گیا ہے اور صدیوں، قرنوں کا لوک ادب اور عوامی دانش کو سمجھنے کے بجائے اسے بالکل ہی الٹ کر پیش کیا گیا ہے اور مطلب بھی اپنی مرضی کا استعمال کیا گیا ہے۔

کہاوت کے مطابق بادشاہوں اور حکمرانوں کے مطابق ہی عوام ہوا کرتے ہیں مگر یہاں بالکل الٹ بات مشہور کی گئی کہ بادشاہ حکمران عوام کی نیکی اور بدی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یعنی کوئی بادشاہ اگر بد ہے جو کہ ہر ایک ہوتا ہی ہے، تو اس کا وبال بھی عوام پر ہے کہ عوام نیک نہیں ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ سرمایہ دارانہ سوچ لوک دانش کو بدل کر بھی اپنے مقاصد کا حصول ممکن بنا سکتی ہے۔

دونوں کہاوتوں کا مطلب، مفہوم اور معنی ایک ہی ہے اور جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ نیک ہو گا تو عوام خود بخود اسے دیکھتے ہیں نیک ہو جائیں گے۔ اور اگر بادشاہ ہی بد اور برائی پہ مائل ہو گا تو عوام تو بالکل بھی برائی کرتے ہوئے نہیں جھجھکیں گے اور بلا عذر برائیاں کرتے رہیں گے۔

کہاوتوں میں معنوی افتراق نہیں بلکہ اشتراک پایا جاتا ہے بلکہ یوں ہی لگتا ہے کہ یہ کہاوت بھی عربی ثقافت سے اردو کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ ان کہاوتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کائناتی رموز اور انسان کی نائبیت کو سمجھنے کے لیے جو اساطیر گھڑی گئی ہیں ان کا بغور مطالعہ بھی ہمیں نئے نئے حقائق سے آشنا کرتا ہے اور یہ تحقیق کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

اسی طرح کچھ ایسی بھی لوک دانش کی باتیں صدیوں سے ہمارے درمیان مشہور ہوتی ہیں کہ ان کا مشاہدہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کرتے بھی ہیں اور جان لیتے ہیں کہ پہلے سے طے شدہ الفاظ اور ان کا معنی غلط طریقے سے ہمارے درمیان مشہور ہے مگر وہ ایک اسطورہ بن چکا ہوتا ہے اس کو اس مفہوم سے الگ کر کے سوچنا اور دیکھنا شاید اب ممکن نہیں رہ جاتا ہے۔

مثلاً اردو میں اس ضمن میں کہاوت دیکھیے:

اردو کہاوت: جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

اور اب اسی مفہوم پہ عربی ثقافت کی کہاوت دیکھیں؛

عربی کہاوت: السنور الصیاح لایصطاد شیئاً۔(18)

مندرجہ بالا دونوں ثقافتوں پر مبنی کہاوتیں دیکھیں تو عربی والی کہاوت اپنے معانی کے ساتھ قریب قریب ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے جس کا مطلب ہے کہ: چیخنے والی بلبلاں کچھ نہیں پکڑتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہاوت ااپنے مطالب کے ساتھ کچھ انصاف کر پاتی ہے کہ جو بلبلاں چیختی رہیں گی وہ کیا خاک شاک رکریں گی۔ مگر ذرا دوسری طرف نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر گرجنے والے بادل برس کر ہی جاتے ہیں۔ یہاں کو یہ یہ کہنا مقصود نہیں کہ لوک دانش یا صدیوں کی علمی میراث میں کوئی غلطی ہے، بات یہ ہے کہ کبھی کسی کے مشاہدے میں ایسا آیا تو اس نے کہہ دیا اور بات چل نکلی، بات ایسی چل نکلی کہ اب بارہا کہ مشاہدے کے باوجود اس کو کوئی بدلنے کی بات نہیں کرتا یا اس جگہ کسی اور کہاوت یا لوک دانش، عوامی علمی سرمائے کو سامنے لانے پہ تیار نہیں کیوں کہ یہ بات یہ ضرب المثل ایک اسطورہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

یعنی اب ہر کوئی ایسے ہی کہتا ہے ہر اس آدمی کو جو باتیں بہت کرتا ہے مگر کام تھوڑا کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ یہی کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ حالانکہ گرجنے والے بھی برس جایا کرتے ہیں۔

معنوی سطح پر عربی کہاوت زیادہ پُر اثر اور حقیقت کے نزدیک ترین ہے۔ مگر اب ممکن ہو سکتا ہے کہ خاموش بلی کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلی چیخے بھی اور شکار بھی حاصل کرلے۔ مگر قرینِ قیاس تو یہی ہے کہ جو بلی بھی شکار کرتے ہوئے چیخے گی وہ شکار سے محروم رہے گی۔

اب یہاں علمی سطح اور اسطورہ کو سمجھنے کے لیے ایک اور زبان یعنی اانگریزی کی بھی اسی موضوع پر کہاوت پیش کی جاتی ہے۔ انگریزی والے کہتے ہیں:Barking dogs, seldom biteیعنی اس سے مراد یہ ہے کہ جو کتے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے

نہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کبھی کبھی کاٹ بھی لیتے ہیں۔یعنی صاف ظاہر ہے کہ کہاوت کے ساتھ ایسا جملہ لگا دینے سے وہ کہاوت کوئی اسطورہ نہیں بن پاتی اور معنی بھی پورے ادا کر دیتی ہے۔اس سارے معاملے میں ہمیں جو نکتہ سمجھنے کے لائق حاصل ہوتا ہے اس کے مطابق ہمیں جان لینا چاہیے کہ اردو والوں کے ہاں بات کو قطعی طور پر پیش کرنے کا بھی رجحانموجود ہے۔جو ایک خطرناک ترین بات ہے۔کیوں کہ قطعیت کے ساتھ بات کرنے سے مشورے،صلاح، تحقیق اور تنقید کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

عربی کہاوت اردو سے کہیں بہتر معنوی مفہوم رکھتی ہے۔اردو کی کہاوت بھی اپنی سطح پر اپنی ثقافت کا بھرپور اظہار کرتی ہے۔بہر حال سارے لوگ تو ایسے نہیں ہوتے جو گرجتے تو ہیں مگر برستے نہیں۔مگر کب کوئی برسنا شروع کر دے کیا معلوم۔

اب اساطیری طور پر ہر علاقے میں ایسی باتیں صدیوں سے موجود سننی پڑتی ہیں کہ جن کا تعلق حقیقت سے نہیں مگر وہ اس طرح علاقائی ثقافت اور رہن سہن میں گھل مل گئی ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ نہیں اور وہ صدیوں سے ایسے ہی سینہ بہ سینہ سنتے چلے آتے ہیں اور یہی توہم اور اساطیری رنگ ہوتا ہے۔جیسے ہم اکثر اپنے علامتی پیرائے میں اور اردو دنیا میں سنتے ہیں کہ کوا اگر دیوار پہ بیٹھا یا چھت پہ بیٹھا بولے تو مہمان کی آمد کا اعلان یا سندیسہ ہوتا ہے اسی طرح بلی راستا کاٹ جائے تو منحوست کی علامت ہے۔یہ باتیں صدیوں سے رائج ہیں اور اسی طرح چلتی آرہی ہیں اور کوئی بھی شخص ایسا نہی جو ان کو مانتا نہیں یا ایسا سنتے ہوئے انکار کرنے کی جرات رکھتا ہو کیوں کہ یہ ثقافتوں کی لوک دانش کا ایک حصہ ہوتا ہے جو آگے چل کر اساطیری رنگ اختیار کر جاتا ہے۔اسی طرح اردو اور عربی ثقافت میں کہاوتیں دیکھیے:

اردو کہاوت؛ کوؤں کے کوسے سے کہیں ڈھور مرتے ہیں؟

عربی کہاوت: لا يضر السحاب نبح الكلاب۔(19)= الكلاب تعوي والقافلة تسير

اب یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہم اکثر ایسا تصور کر لیتے ہیں اور اساطیری طور پر یقین کرنے لگتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمیں بددعا دے یا ہمارے حق میں بدشگونی کرے تو ہمیں یوں لگنے لگتا ہے کہ ایسا ممکن بھی ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص نے ہمیں بددعا دی ہے تو ممکن ہے کہ ہمارے حق میں برا ہی ہو۔ ایسے ہی جب کوئی ہمیں دعا دیتا ہے تو ہم اس کی دعا پہ یقین لے آتے ہیں اگرچہ دعا دینے والا خود دعا کا مستحق اور گناہ گار ہی کیوں نہ ہو۔

یہ معاملہ اور ایسا ہی دستور ہماری ثقافتوں میں اسطورہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اور ہم اس پر یقین بھی لے آتے ہیں حالانکہ اس کے کلاف لوک دانشوں میں ضرب الامثال بھی موجود ہیں۔ اردو والی ضرب الامثل میں صاف لکھا ہے کہ کوے جتنا بھی کوس لیں، برا بھلا کہہ لیں مگر ان کی بددعاؤں کی وجہ سے ہمارے جانور نہیں مریں گے اور نہ ہی ہمارا نقصان ہو گا۔ یعنی دشمن ایسا سوچتے ہیں کہ دوسرے کا نقصان ہو اور ہمارا فائدہ ہو اور وہ ایسا بارہا کہتے رہتے ہیں جیسے کوے دعا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی کے جانور مر جائیں اور ہم اس کا گوشت کھائیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا یہ ایک اسطورہ ہے کہ فلاں آدمی کے کہنے سے ایسا ہو جائے گا مگر ایسا ہوتا نہیں۔

اسی طرح عربی کہاوت کا مطلب ہے کہ؛ کتوں کے بھونکنے سے بادلوں کا نقصان نہیں ہوتا۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ بادل نے اگر فائدہ پہنچانا ہے تو وہ پہنچائے گا اور اگر نہیں برسنا اور فائدہ نہیں کرنا تو کتوں کے بھونکنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ یہ لوک دانش اور عوامی ذہانت ہی ان کہاوتوں اور ضرب الامثال کو معنی خیزی عطا کرتی ہے۔

دونوں ضرب الامثال کا ثقافتی اسطورہ میں رنگ واضح ہے اور فرق بھی ظاہر ہے۔ معنوی سطح پر دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے مگر لفظوں کے اختلاف اور افتراق سے اپنی اپنی ثقافت جھلکتی نظر آتی ہے۔

اردو اور عربی میں بہت سی ایسی اساطیر بھی مشہور ہیں جو کہ قرآن میں آئی ہیں اور ان کو من وعن تسلیم بھی کر لیا گیا ہے اور ان کے تسلیم کرنے کی وجہ دین اور مذہب اسلام پر ایمان ہے۔ مگر قرآن میں آنے والی اسایری کہانیاں اپنے ایمانی ہونے کی وجہ سے اس قدر زیادہ بوی اور سمجھی گئیں کہ وہ لوک دانش اور عوامی سطح پر عقل کی دلیل بنتی چلی گئیں اور یوں وہ ضرب الامثال اور کہاوتوں کا درجہ اختیار کر گئیں۔ ان میں خضر، موسیٰ، فرعون، آتشِ نمرود اور یوسفؑ کے واقعات اور حضرت یونسؑ کی مچھلی اور پھر ایک عظیم طوفان اور عظیم کشتی کا ذکر بھی شامل ہیں۔

ان اساطیری کہانیوں سے کئی ایک کہاوتیں بھی مشہور ہوئیں جن میں ایک اردو اور عربی میں مستعمل ہے، دیکھیے:

اردو کہاوت: ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ہے۔

عربی کہاوت: لکل فرعون موسیٰ۔(20)

ضرب الامثال کے معنی اور مفاہیم تو بالکل واضح ہیں اور یہاں ان کی لفاظی اور مفہوم پہ بات کرنا دونوں کو بیان کرنا ہے۔ مگر یہ ایک تلمیح ہے اور اسی تلمیح سے ہی اس کہاوت کی سمجھ آتی ہے۔

فرعون وقت کا ظالم بادشاہ تھا اور مصر پہ حکومت کرتا تھا۔ مگر یہاں پہ عرصہ دراز سے اسرائیلی غلام تھے اور ان سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ بادشاہ وقت نے خواب دیکھا جس کی تعبیر میں تمام ملک کے بچوں کو جو لڑکے پیدا ہوں تو ان کو مر دینے کا حکم ہوا۔ مگر موسیٰ کو رب نے بچا لیا اور اسی کے گھر میں انھوں نے پرورش پائی اور پھر وہاں سے ہجرت کر کے مدائن چلے گئے اور بعد میں مدائن سے مصر آکر اس بادشاہ وقت یعنی ظالمفرعون کی حکومت کو گرایا جو خود کو خدا کہلواتا تھا۔ وہاں سے یہ اساطیری کہانی وجود میں آئی اور یہیں سے یہ اساطیری کہاوت بنی۔ اس کہانی میں اساطیری بہت سے معاملات ہیں سب سے بڑھ کر موسیٰؑ کے لیے دریائے نیل کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا اور ان کی قوم کا اس میں سے گزرنا، موسیٰ کا دربار فرعون میں اپنے عصا سے دوسرے جادوگروں کے سانپوں کو و نگلوانا اور انھیں مار ڈالنا۔ دریائے نیل کا پانی خون میں بدلنا اور مینڈکوں کا شہر پر قبضہ کر لینا اور اسی طرح کی کئی ایک چیزیں کہ جو اس موسوی کہانی کو اساطیری بناتی ہیں اور یہ بھی کتنا اسطوراتی معاملہ ہے کہ بادشاہ کے محل میں ہی اس کا دشمن پلا بڑھا اور اس نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی یعنی یہ بھی تو اس کہاوت کو معنی خیزی اور بہترین مفہوم عطا کرتا ہے کہ بادشاہ چاہے جتنا بھی ظالم اور وقت کا فرعون ہی کیوں نہ ہو خدا اسی کے گھر میں اس کے دشمن موسیٰ کو پال کر دکھاتا ہے اور اس سے ہی اس کو شکست دلواتا ہے۔

اسی طرح بہت سی لوک کہانیاں اور واقعات بھی ہمارے علاقوں میں زباں زد عام ہو جاتے ہیں۔ جن سے منسوب بہت سے قصے اور کہانیاں ہمارے عوام میں مقبول اور عام ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اس کا ادراک تک نہیں ہوتا کہ اصل کیا ہے اور نقل کیا اور وہ ادبی زبان کے مطابق ایک تلمیح کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور وہ کردار ایک عظیم اور بھلے ہوتے ہیں کہ ہماری نسلوں میں سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور اساطیری درجہ اختیار کر جاتے ہیں۔

ایسے ہی کردار دنیا بھر میں بھی سفر کرتے اور مسافروں کے ذریعے کہانیوں کے ذریعے یا پھر ادب میں لکھتے لکھاتے یہ کردار کیا سے کیا بن جاتے ہیں اور اصل میں لیجنڈز کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں۔ جن میں لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں اور مرزا صاحبہ جیسے کئی کردار اور کہانیاں مل جاتی ہیں اور پھر انھی کہانیوں اور کرداروں سے متعلقہ اساطیری واقعات اور ضرب الامثال بھی مشہور ہو جاتی ہیں۔ جن میں سے دو زبانوں کی ابھی دیکھتے ہیں:

اردو کہاوت: لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھو۔

عربی کہاوت: حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ ۔(21)

اب ان دونوں کہاوتوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ کس طرح ایک لیجنڈری کردار اساطیری رویوں میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اس سے کئی کئی طرح کے واقعات منسلک ہو جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر لیلیٰ اور مجنوں کا واقعہ اور محبت بھری کہانی تو عربی داستانوں میں ملتی ہے مگر یہ ایک ایسا اساطیری کردار ہے کہ یہ تقریباً سنیا بھر میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں بہر حال موجود ہے۔ اسی طرح اردو میں بھی موجود ہے اور خطۂ ہندوستان میں اس پر کئی ایک داستانیں اور مختلف واقعات مشہور

ہیں۔ جن سب کا لب لباب اور نچوڑ یہی ہے کہ لیلیٰ کو نجب تک مجنوں کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اس کی خوبصورتی اور محبت ظاہر نہیں ہو گی۔

بات یہ ہے کہ لیلیٰ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بدصورت تھی اور مجنوں بہت خوبصورت تھا مگر پھر بھی مجنوں لیلیٰ سے محبت کرتا تھا اور نہ صرف محبت کرتا تھا بلکہ دنیا جہاں کی ہر چیز سے افضل اور خوبصورت مانتا تھا۔ ایک یہ بھی حوالہ مشہور ہے کہ لیلیٰ چونکہ زیادہ سیاہ اور کالی رنگت کی تھی اس لیے بھی اسے لیلیٰ یعنی رات کے معنوں میں سیاہ کہا جاتا تھا۔

اسی طرح یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ جب بھی کوئی کہتا کہ لیلیٰ خوبصورت نہیں تو اسے کہا جاتا کہ تم لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھو گے تو وہ تمھیں حسین ہی معلوم ہو گی۔ اسی لیے کسی کام کے حوالے سے جب کرنے کی یا کوئی ماننے کی بات ہو یا اس کی محبت کی بات ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کام کو کرنا ہے تو فلاں آدمی کی محبت میں کہو۔

اس کہاوت کا، ضرب المثل کا یوں اساطیری لہجہ اور مقام حاصل کر لینا خود میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ کہ جب تک کسی کی پسندیدہ چیز کو اس کے چاہنے والے کی نظر ست نہیں دیکھا جائے گا تو وہ خوبصورت نہیں دکھائی دے گی۔ بلکہ ایک بوجھ اور کم تر چیز دکھائی دے گی۔

مگر عربی کہاوت اس سے مختلف ہے اگرچہ معنوی سطح پر دونوں کہاوتیں قریب قریب ہیں اور مفہوم بھی ایک ہی ہے مگر لفاظی کے اختلاف کی بنا پر دونوں میں ثقافتی اور جغرافیائی فرق موجود ہے۔

عربی کہاوت کا مطلب ہے کہ کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔اب اسے اردو کی کہاوت کے ساتھ متعلق کرنے کی ضرورت ہے کہ معنوی سطح پر دونوں کہاوتوں کا تعلق بنتا ہے کہ اگر لیلیٰ کی محبت کی بات ہو گی تو مجنوں کو کچھ سمجھ نہیں آءے گا جس طرح لیلیٰ کہے گی ویسے ہی مجنوں کرلے گا اور اپنی عقل، سمجھ اور بوجھ استعمال نہیں کرے گا۔اسی طرح عربی میں کہتے ہیں کہ اگر آپ کو کسی سے محبت ہو گئی ہے تو آپ اس کی طرف سے اندھے، گونگے اور بہرے ہو جائیں گے یعنی اس کی غلط بات آپ کو سنائی نہیں دے گی،غلط حرکت نظر نہیں آئے گی اور کسی غلط بات پر آپ اسے روکیں گے نہیں۔اس طرح مجنوں اور کوئی بھی عاشق ایک عشق کے مرتبے پہ قائم ہے جسے اپنے محبوب کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

اگرچہ مجنوں اور لیلیٰ کا اساطیری کردار کا حقیقی تعلق عرب سے ہے مگر یہاں اس معنی میں یہ کہاوت عربی کے بجائے اردو میں استعمال ہوئی ہے۔اس لحاظ سے اس ضرب المثل کے اساطیری ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اساطیری دانش کل جہاں کی دانش ہوتی ہے۔

اساطیری اور مافوق الفطرت معاملات میں عجیب و غریب اور حیران کن کہاوتیں اور ضرب الامثال بھی مل جاتی ہیں مگر وہ اپنے مفہوم میں ایسی دلکش اور پت کشش ہیں کہ انکے کہے کے بغیر بات میں مفہوم مکمل ہی نہیں ہوتا۔

عربی اور اردو دونوں زبانوں اور ان زبانوں کی ثقافتوں مُن ایسی کہاوتیں مل جاتی ہیں کہ جن سے اان کے اساطیری پہلو زیادہ نمایاں ہو کے سامنے آتے ہیں۔ضرب الامثال دیکھیے:

اردو کہاوت: مجنوں کے لیے لیلیٰ ہی شفا ہے۔(22)

عربی کہاوت: وذكرك يشفيني إذا خدرت رجلي ۔(23)

اردو کہاوت تو سامنے کی چیز ہے اور اس پر اساطیری پہلو سے پہلے بھی بات ہو چکی ہے۔ مگر اس کہاوت کو ایک اور بھی طرح سے بیان کیا جاتا ہے جیسے؛ مجنوں کا علاج لیلیٰ ہے۔ بہر حال اردو کی دونوں کہاوتوں کا مطلب ایک ہی ہے اور یہ اپنے آپ میں ایک اساطیری پہلو بھی رکھتا ہے اور ثقافتی جگرافیائی پہلو بھی کہ جس آدمی کو جو چیز چاہیے ہوتی ہے وہ اسی پر قناعت اختیار کرتا ہے اور اس کے تمام مسائل کا حل بھی وہی چیز ہوتی ہے۔

مگر عربی کہاوت ذرا مختلف ہے کہ اس میں اساطیری اور خارقِ عادت بہت سے پہلو ہیں۔ڈاکٹر خورشید رضوی نے اس کہاوت کی بابت عربی کا مکمل شعر نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ عربیوں میں یہ اساطیری پہلو پایا جاتا تھا اور اب بھی کہیں کہیں نہ پایا جاتا ہے یا کم از کم ان کی شاعری میں ضرور پایا جاتا ہے کہ انھوں نے اس پر ایک عربی شعر بھی درج کیا ہے۔ کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ؛ جب میرا پاؤں سُن ہوتا ہے تو تیرا نام لینے سے مجھے شفا ملتی ہے۔اب یہاں تیرا سے مراد، محبوب ہے کہ محبوب کا ذکر ہی باعثِ شفاعت ہے۔ مگر یہ شعر ایک ضرب المثل سے بنا جو اوپر درج ہے۔ مکمل شعر دیکھیے:

و أنت لعيني قرة حين نلتقي

وذكرك يشفيني إذا خدرت رجلي (24)

ترجمہ: جب ہم ملتے ہیں تو تُو میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اور جب میرا پاؤں سُن ہوتا ہے تو تیرا نام لینے سے مجھے شفا ملتی ہے۔

یہ پہلو بالکل اساطیری اور توہماتی ہے کہ لوگ جب کسی اپنے کا نام لیتے یا پکارت تھے تو انھیں آرام آجاتا تھا۔ یہ بات اس قدر عام ہوئی اور ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئی کہ شعرا نے اسے اپنے اشعار میں باندھا۔

دونوں کہاوتوں کو دیکھیں تو اپنی اپنی ثقافت اور جغرافیے کے لحاظ سے دونوں میں ہی کامل کیفیت پائی جاتی ہے مگر عربی کہاوت اساطیری پہلو کے لحاظ سے زیادہ معتبر اور بامعنی تصور ہوتی ہے اور اس میں اساطیری پہلو بھی زیادہ ہیں۔ مجنوں اور لیلیٰ والی بات بھی انی جگہ خوب ہے مگر اس کے لیے اہم تشبیہاتی بات کر سکتے ہیں اور معنی اسطورہ سے کم ہو کر عام سطح پر آجاتے ہیں مگر جب کسی کے نام سے سویا ہوا پاؤں ٹھیک ہو جائے تو یہ زیادہ اسطوراتی بات کہلاتی ہے۔

مجنوں اور لیلیٰ کا ذکر بھی کافی جگہوں اور اشعار میں وارد ہوا ہے اور شاعروں نے اس پر خوب قصے کہانیاں اور فلمیں تک بنائی ہیں۔ اسی طرح عربیوں نے بھی کہاوت کو استعمال کرتے ہوئے اس پر اشعار کہے ہیں اور نثر میں اس کو عمدگی سے استعمال کیا ہے۔

ضربالامثال کا ذکر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی ہر زبان میں اسی کی بدولت ایک خاص طرح کی دانائی اور لوک دانش جھلکتی ہے خواہ اس کا تعلق مذہب سے ہو یا سماجیات سے ہو یا پھر اساطیری معاملاتِ زندگی سے ہو یا پھر کسی مافوق الفطرت چیز سے، یہ ضرب الامثال اپنی ثقافت کے پورے رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں اور زبان میں مفاہیم کو رنگارنگی اور ثقافتی عظمت عطا کرتے ہوئے زبان، مفہوم اور معنی کو مطلوبہ اور متعلقہ زمین کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں۔

اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ہر کہاوت یا ضرب المثل کسی نہ کسی عام اور سامنے کی چھوٹی بڑی صداقت کی تائید کرتی نظر آتی ہے اور اسی صداقت میں عام عوام کا عمومی رویہ اور نسلوں کی تجربات کی رنگارنگی بھی نظر سے گزرتی ہے۔اسی وجہ سے تو ضرب الامثال کو عام عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور یہ عوامی اور لوک دانش کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔یہی تو کمال ہے کہ ضرب الامثال عوامی سطح سے علمی سطح تک پہنچتی ہے یا یوں کہہ لینا زیادہ مناسب ہو گا کہ کہاوتیں معاشرے کی گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے جامعات کے نصاب اور کتابوں میں جا پہنچتی ہیں۔مگر باقی بہت سی چیزیں اور زبان کے لوازمات عام عوام سے کتابوں میں نہیں بلکہ کتابوں سے عام عوام تک پہنچتی ہیں یا نہیں پہنچتی اور کہیں کتابوں میں ہی کھو جاتی ہیں۔اسی لیے کہاوت میں زیادہ دانش اور مقبولیت اور ثقافتی عناصر کی بازگشت ہوتی ہے کہ یہ زمین سے اٹھ کر صفحوں میں جابسیرا کرتی ہے۔

تمام کہاوتوں پہ نظر ڈالیں تو ہمیں یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ کہاوتوں میں تمام تر دانش کا رویہ نہیں اپنایا جاتا بلکہ اس میں لوگوں کی طرف سے یوں ہی کہہ دیا جانے بھی بعض اوقات عام ہو کر کہاوت تک پہنچ جاتا ہے اور وہ صدیوں رائج رہتا ہے۔جیسا کہ ہم نے اساطیری یا توہمات یا رسوماتی ضرب الامثال کے بارے میں پڑھا اور جانا ہے۔بعض ایسی ضرب الامثال تو ابھی تک رائج ہیں اور ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے اور انھیں دانش کا حصہ بھی مانا جاتا ہے حالانکہ وہ سراسر اساطیری یا توہماتی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس میں یہ بھی ضروری بات نہیں کہ کہاوت کوئی علمی یا دانش کی ہی بات کرے بعض اوقات تو خوامخواہ کی باتیں بھی کہاوتوں کے درجے پہ فائز ہو جاتی ہیں اور ہم انھیں دہراتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کہاوت زندگی کی کوئی نہ کوئی سچائی ہی پیش کرے۔

حوالہ جات

1۔ یونس اگاسکر، ڈاکٹر، اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو، نشریات اردو بازار، لاہور، 2011ء، ص264

2۔ زیب النساء علی خان / مہرداد علمداری (مرتبین)، مشترک ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2005ء، ص23

3۔ أیضاً، ص33

4۔ أیضاً، ص34۔35

5۔ أیضاً، ص36

6۔ أیضاً، ص48

7۔ خلیق احمد صدیقی (مرتب)، کہاوتوں کی کہانیاں، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، 2021ء، ص25

8۔ مشترک ضرب الامثال، ص50

9۔ أیضاً، ص54

10۔ أیضاً، ص54

11۔ حضرت علی صاحب، مفتی، قاموس المعنون، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، 2011ء، ص553

12۔ ایضاً، ص554

13۔ اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، ص231

14۔ احمد حسین خان، نواب، گلدستہ امثال، نظامی پریس، لکھنو، س ن، ص45

15۔ اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، ص232

16۔ مشترک ضرب الامثال، ص17

17۔ ایضاً، ص39

18۔ ایضاً، ص42

19۔ ایضاً، ص53

20۔ گلدستہ امثال، ص53

21۔ مشترک ضرب الامثال، ص99

22۔ اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو، ص346

23۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، عربی ادب قبل از اسلام (جلد اول)، ادارۂ اسلامیات، لاہور، 2021ء، ص143

24۔ ایضاً، ص143

باب چہارم:

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

ا۔ مجموعی جائزہ:

ضرب الامثال کے بارے میں عمومی رویہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسا جملہ ہوتا ہے جس میں صدیوں اور نسلوں کی دانش عود کر آتی ہے اور ایک معاشرے کی دانائی اکائی کی طرح کسی بھی ضرب المثل میں واضح ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ضرب المثل کا جملہ فقط جملہ ہی نہیں ہوتا اس کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے جو ایک وسیع معانی کی حامل ہوتی ہے اور اس میں علامتی ورمزیہ پیرائے میں اتنا کچھ سمٹ آتا ہے کہ اس موضوع کی مناسبت سے کوئی بھی واقعہ یاروداد یا موقع ہو تو اس کو بول کو بات کو مزید قابلِ فہم بنایا جاسکتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بات کا مفہوم بھی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

ضرب المثل دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں اور ان سب میں کہیں نہ کہیں مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔اپنے اپنے علاقے کی ثقافت اور لوگوں کا رہن سہن ضرب المثل میں کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ضرب المثل کو اردو میں کہاوت بھی کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اس کے لیےProveb یاSaying کے الفاظ بولے جاتے ہیں اور بھی ایک دو لفظ ہیں مگر زیادہ یہی مستعمل ہیں۔ضرب المثل نہ صرف دانش و حکمت کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہے بلکہ اس میں سماج، رسومات اور رواجات کی طرف مکمل اشارہ بھی موجود ہوتا ہے۔

کہاوتیں صرف دانش ہی کا مرقع نہیں ہوتیں بلکہ اس میں ایسا کچھ بھی موجود ہوتا ہے کہ جو آج کے زمانے میں قابلِ قبول یا مستعمل نہیں ہے۔ یہ توہمات کا کارخانہ بھی ہو سکتی ہیں اور دھوکے کا سامان بھی۔ تیر وطنز کا بھی کا کام کرتی ہیں اور بات کی گہرائی کے رموز بھی چھوڑتی ہیں۔اساطیری حوالے بھی اس میں مل جاتے ہیں اور ہر علاقے کی اپنی اپنی بودوباش، رہتل، ثقافت، تہذیب، رسومات، رواجات، طرزِ زندگی، علوم وفنون اور ذات پات کے مسائل اور مذاہب کی رنگا رنگی بھی میسر آجائے گی۔

ضراب الامثال کے مطالعے سے لسانی تغیرات کا بھی پتا چلتا ہے اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اور کس کس زمانے میں کون کون سی لفاظی اپنی اصل حالت سے موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ ضرب المثل کا مختصر ہونا، بر محل معنوی زور اور اس کا کثرتِ استعمال ہی اسے ضرب المثل بننے میں اور بولنے میں مدد فراہم کر سکتا ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ کثرت استعمال سے مراد کسی بھی ضرب المثل کا قبولِ عام کی سند حاصل کرنا ہے کہ ہر کس وناکس اس سے نا صرف واقف ہو بلکہ اس کا استعمال بھی کرتا ہو۔ ہر قسم کی عوام اور طبقات میں اس کا استعمال ہوتا ہو۔لوگ بر محل بول کر اس کے معنوں میں اضافہ کر سکتے ہوں اپنی بات کی تفہیم کو بڑھا سکتے ہوں۔ ایسی ضربالامثال میں تجربات سے حاصل شدہ دانش بھی ہو اور ایسے عناصر کا ہونا بھی کسی مصرعے یا جملے کو ضرب المثل بنا سکتا ہے۔ مگر صرف کسی بزرگ کا قول ہونا، صدیوں کی دانش یا تجربات کا نچوڑ ہونا یا پھر وہ کتنا ہی اختصار وایجاز یا پر زور معنویت کا حامل ہو مگر، اگر اس میں قبولِ عام ہونے کی سکت نہیں اور ابھی تک اس نے قبول عام کی سند حاصل نہیں کی تو اسے کہاوت یا ضرب المثل نہیں کہا جا سکے گا کہ اسے صرف ایک خاص طبقہ ہی پڑھتا اور بولتا ہو اور بر محل استعمال سے بھی سب اس کی تفہیم سے آگاہ نہ ہو سکیں۔

اسی طرح ہم کہاوت یا ضرب المثل میں ایک اور چیز کے خواہاں ہیں کہ ضرب المثل قبول عام کی سند کے ساتھ ساتھ ایک خاص سچائی کی بھی حامل ہو کہ جس میں آفاقیت ہو اور لوگ اس پر انگلی نہ دھر سکیں اور فوراً کہیں کہ ہاں! یہ ہوئی نا بات۔ اور یہی ایک عام سچائی ایک ایسی چیز ہے کہ جو کسی بھی جملے یا مصرعے کو قبول عام کی سند دلوا سکتی ہے۔ وگرنہ اچھے سے اچھا مصرعہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ وہ شعر میں تو سجے گا مگر کہاوت نہیں کہلا سکے گا۔

ایک اور بات بھی کہاوت کو کہاوت بناتی ہے کہ اس میں عوامی سچائی، قبولِ عام ہونے کی سند، اختصار اور معنوی زور کے باوجود سینہ بہ سینہ چلنے کی روایت موجود ہو تاکہ کسی بڑے آدمی کا قول اور کہی گئی بات کہاوت بننے کی اصول سے ایک قدم پیچھے رہے۔ وگرنہ موجودہ عہد میں ہر کوئی اپنی کہی ہوئی بات کی سچائی کو واضح کر کے کہاوتوں کے انبار لگانے لگے اور اس میں صدیوں اور نسلوں کی دانش کا نچوڑ نہ ہو تو فائدہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایسی کہاوت تو ہر کسی کو بتانی پڑے گی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہی تو وہ خصوصیت ہے کہ جو کسی بھی ضرب المثل کو قبول عام کی سند دلواتی ہے۔

کہاوت یا ضرب المثل کے بارے میں بہت سے نظریات اور تعریفیں پائی جاتی ہیں اور ان سب کے مجموعے کو اگر دیکھیں تو ہم کچھ ایسے ان تمام مطالب کو دہرا سکتے ہیں اور ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ: ضرب المثل دانش مند لوگوں کی باتیں اور اقوال ہوتے ہیں اور یہ ایسے جملے یعنی مختصر کہی گئی باتیں ہیں کہ ان کے اندر صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ کچھ فیصلے بھی ایسے ہوتے ہس کہ جنھیں صدیوں یاد رکھا گیا ہو اور بار بار دہرانے سے ضرب المثل بن گئے ہوں۔ یا ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے بعض ایسی پابندیاں یا قوانین بھی بنا لیے کہ بعد میں آنے والے لوگوں نے اسے من و عن مان

لیا اور مشہور ہو کر وہ ضرب المثل بن گئے۔ یہ ایسے جملے ہیں کہ جنھیں پڑھے لکھے اور ان پڑھ برابر سمجھتے جانتے اور ان کو دہراتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم من جملہ کہہ سکتے ہیں کہ کہاوت میں چھے طرح کے عناصر کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہونا لازم ہیں:

1۔ دانش 2۔ اختصار 3۔ طویل تجربات

4۔ قوانین 5۔ ذہانت 6۔ غیر معمولی طرز بیان

ہم جانتے ہیں کہ عرب والوں نے ایران کو فتح کیا اور ایران والوں نے ہندوستان کو فتح کیا۔ اس لحاظ سے یوں ہوا کہ عرب کی ثقافت و تہذیب، ایران میں پہنچی اور پھر ایرانی مع عربی مرکب تہذیب و ثقافت ہندوستان میں آ آباد ہوئی۔ اب اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ عربوں کے لسانی اثرات، فارسی سے ہوتے ہوئے اردو پر براہِ راست پڑے اور اردو میں عربی و فارسی کے اثرات کا غلبہ ہوا۔ اس طرح ہی دنیا بھر کی اقوام نے مختلف اقوام کی زبانوں سے تصرف کیا اور اپنے اپنے اثرات بھی چھوڑے۔ یوں ایک کہاوت یا ایک طرح کے واقعے پر کہے گئے جملے لسانی تصرفات اور تبدیلیوں کے ساتھ دنیا بھر میں گھومتے اور دکھائی دینے لگے۔ اسی لیے جب دو مختلف تہذیبوں، ثقافتوں یا لفاظی و لسانی تغیرات کا تقابل کیا جائے تو بہت اچھے اور بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں اور ہمیں یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ کہاوتیں دنیا کی اجتماعی دانش ہے کہ جس میں دنیا بھر کے لوگوں کے تجربات کا نچوڑ اور علم پایا جاتا ہے۔

اردو اور عربی ثقافتوں کا مطالعہ اس ضمن میں یہ ہمیں بتاتا ہے کہ بہت سے خیالات اور لسانی اثرات اردو نے عربی سے براہ راست اور بعض جگہوں پر معنوی مفہوم اخذ کیا ہے۔جب معنوی مفہوم اخذ کیا ہے تو اردو نے اپنی ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کو زندہ رکھا ہے اور عوام کی آواز کو عالمی آواز میں شناخت عطا کی ہے کیوں کہ ضرب المثل کا چلن ہی عام عوام سے اور ان پڑھ آدمی کے بولنے سے ہوتا ہے۔

ثقافتوں کا ضرب الامثال کے حوالے سے مطالعہ اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اس سے ہمیں دو مختلف سوچوں،خیالوں اور لوگوں کے نظریات کا علم ہوتا ہے۔اردو والوں کے لیے عربی معاشرت کوئی زیادہ اجنبی نہیں مگر پھر بھی کہاوتوں کو پڑھ کر اور ان کا تقابل کرکے وہ یہ جان سکتے ہیں کہ عربوں کی ثقافتی خصوصیات کیا ہیں اسی طرح عرب بھی اردو کی کہاوتوں اور ضرب الامثال کو جان کر پڑھ کر ان کی ثقافتی خوبیوں سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں جو کہ اس مقالے کا بھی مقصد تھا۔

ب۔نتائج

اس تحقیق کے نتائج درج ذیل ہیں:

1۔ کسی بھی ضرب المثل میں ثقافتی اظہار کے لیے علاقائی بودوباش،رسوم ورواجات،علوم و فنون اور مقامی مذہبی رسوم،توہمات اور اساطیر کو برتا جاتا ہے۔

2۔ عربی اور اردو کی بعض ضرب الامثال میں لسانی ولفظی افتراق کے علاوہ معنوی مفہوم اور دانش میں فرق نہیں ہے۔

3۔ اردو اور عربی کی بعض ضرب الامثال میں لفظی و لسانی افتراق کے ساتھ معنوی مفہوم میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔

4۔ عربی اور اردو کی بعض ضرب الامثال میں لفاظی اور معنی کا کوئی فرق نہیں کہ دونوں میں ایک ہی جیسی دانش ظاہر ہوتی ہے۔

5۔ اردو کی بعض ضرب الامثال پر عربی ثقافت کا اثر ملتا ہے، جس کی وجہ مذہب اسلام ہے۔

6۔ عربی ضرب الامثال معنوی سطح پر اردو کی ضرب الامثال سے کہیں بہتر مفہوم رکھتی ہیں۔

7۔ بعض عربی ضرب الامثال قرآن یا حدیث ہیں، جب کہ اردو میں ایسی کوئی ضرب المثل نہیں؛ اگر کوئی ہے تو وہ عربی کہاوت کا ہی ترجمہ ہے۔

8۔ اردو اور عربی ضرب الامثال میں اپنی اپنی جغرافیائی ثقافت کا بھرپور ذکر ملتا ہے۔

9۔ اردو کی ایک بھی کہاوت کا اثر عربی کہاوتوں پر نہیں ہے، جب کہ عربی کی کہاوتوں کا اثر ہے۔

ج۔ سفارشات

اس تحقیق کے تناظر میں چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ اردو اور عربی محاوروں کا بھی ثقافتی سطح پر تقابل ہونا چاہیے۔

2۔ اردو اور عربی ضرب الامثال کا مذہبی و لسانی تقابل بھی ہونا چاہیے۔

3۔ عربی اور اردو ضرب الامثال کے تناظر میں ثقافتی شو اور مقابلے منعقد کروانے چاہییں۔

4۔ عربی اور اردو کے ثقافتی اشتراکات کو سمجھنے کے لیے دونوں ثقافتوں سے مندوبین پر مشتمل کانفرنسیں کروانی چاہییں۔

5۔ ضرب الامثال کے استعمال سے ایک شخص اپنی شناخت، ثقافت، تہذیب اور سماج سے کیسے واقف ہوتا ہے۔اس حوالے سے بھی کام ہونا چاہیے۔

کتابیات

احمد ندیم قاسمی (مرتب)، ثقافت کیا ہے ؟، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 2012

بابو کالی چرن صاحب، المثل فی الکلام کالملح فی الطعام، مطبع سوسائٹی، بریلی، 1940

ڈاکٹر خورشید رضوی، عربی ادب قبل از اسلام (جلد اول)، ادارۂ اسلامیات، لاہور، 2021ء

ڈی۔ڈی۔ کوسمبی، قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1979

خلیق احمد صدیقی، کہاوتوں کی کہانیاں (مرتبہ)، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، 2021ء

خواجہ محمد عبد المجید دہلوی، ضرب الامثال قصہ طلب، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1938

زیب النساء علی خان / مہرداد علمداری (مرتبین)، مشترک ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2005

سید ابوترائی خطائی ضامن، ضرب الامثال اور ان کا پس منظر، اردو لائبریری سنٹر، بنگلور، 1981

شریف احمد قریشی، ڈاکٹر، کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر، دارالنور، لاہور، 2012ء

شمس بدایونی، شعری ضرب الامثال، روشن پبلیکیشنز، یوپی، 1982ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اقبال اور ثقافت، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1986ء

مفتی حضرت علی صاحب، قاموس المعنون، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، 2011ء

مقبول الٰہی، اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1996ء

نواب احمد حسین خان، گلدستہ امثال، نظامی پریس، لکھنو، س ن

وارث سرہندی، مرتب، جامع الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء

یونس اگاسکر، ڈاکٹر، اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو، نشریات اردو بازار، لاہور، 2011ء

لغات

احمد دہلوی، سید، فرہنگ آصفیہ جلد سوم، اسلامیہ پریس، لاہور جنوری 2006

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد یازدہم، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ)، کراچی، جون ۱۹۹۳ء

عبد الحکیم خان، ابو نعیم، نشتر جالندھری، قائد اللغات، (نظر ثانی و اضافہ سید حامد لطیف چشتی) حامد اینڈ کمپنی، لاہور

نور الحسن نیر، نور اللغات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ،۱۹۸۹

وارث سرہندی، مرتب، دیباچہ جامع الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء

مجمع الأمثال تألیف: أبو الفضل أحمد بن محمد بن أحمد بن ابراھیم، النیسابوری، المیدانی المتوفی فی سنة 518 من الھجرة، حققه وفصله وضبط غرائبه وعلق حواشیه: محمد محی الدین عبد الحمید۔ 1374ھ، 1955م